ارخاطر

کے نام

دیباچہ ۷
سید امتیاز علی تاج ۹
حفیظ جالندھری ۳۱
حفیظ ہوشیار پوری ۴۲
عابد علی عابد ۵۱
حضرت جگر مراد آبادی ۶۰
عشرت رحمانی ۶۸
فضل احمد کریم صاحب فضلی ۷۸
سید محمد جعفری ۸۶
مولانا ابوالکلام آزاد ۹۱
راز مراد آبادی ۱۰۱
پنڈت آنند نرائن ملا ۱۰۶
بابائے اردو ۱۱۷

بہزاد لکھنوی ۱۲۷
ارشد تھانوی ۱۳۲
محمود نظامی ۱۳۷
مجید لاہوری ۱۴۲
پنڈت جواہر لال نہرو ۱۴۷
صوفی غلام مصطفیٰ تبسم ۱۵۲
مولانا عبدالماجد دریا بادی ۱۵۷
صباح الدین عمر ۱۶۷
لتا منگیشکر ۱۷۲
حکیم محمد امین ۱۷۷
حضرت تسکین قریشی ۱۸۲
نسیم ممتاز سید ۱۸۷
مولوی عبدالرؤف عباسی ۱۹۲
مولانا نیاز فتحپوری ۱۹۷
سید ذوالفقار علی بخاری ۲۰۲
ڈاکٹر عبادت بریلوی ۲۰۷
پروفیسر وقار عظیم ۲۱۲

کرنل شفیق الرحمٰن	۲۱۷
میجر منان اللہ بیگ	۲۲۲
میر عزت حسین	۲۲۷
مولانا عبدالمجید سالک	۲۳۲
ساغر نظامی	۲۳۷
اقبال صفی پوری	۲۴۲
پروفیسر مسعود حسن ادیب	۲۴۷
حاجی محمد مصطفےٰ خاں	۲۵۲
امین سلونوی	۲۵۷
کنور مہندر سنگھ بیدی	۲۶۲
ظریف جبلپوری	۲۶۷
پنڈت ہری چند اختر	۲۷۲
نواب مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی	۲۷۷
سراج لکھنوی	۲۸۲
فیض احمد فیض	۲۸۷
شکیل بدایونی	۲۹۲
ماہر القادری	۲۹۷

احمد ندیم قاسمی ۳۰۲
شوکت تھانوی ۳۰۷

دیباچہ

محمد طفیل صاحب جن کا کوئی تخلص نہیں ہے برسوں معصروں میں گذر رہے ہیں ان کی خاطر مجھے بیحد عزیز ہے اور میں خود ان کے لئے "بارِ خاطر" کی حیثیت بھی رکھتا ہوں اور "یارِ شاطر" کی بھی۔ چنانچہ یہ مجموعہ جو کچھ بھی ہے ان ہی کی ایک فرمائش کی تعمیل ہے۔ "غبار خاطر" دیکھ کر میں نے ازرہِ شامتِ اعمال چند خطوط ان کے رسالۂ "نقوش" کے لئے لکھے تھے معلوم نہیں وہ کونسی گھڑی تھی جب یہ خطوط لکھے گئے تھے کہ اس جرم کی سزا مجھ کو اور خود طفیل صاحب کو مدتوں بھگتنا پڑی۔ ان کا اصرار کہ میں اسی قسم کے خطوط کا ایک مجموعہ تیار کر دوں اور میرا اس فرمائش سے فرار۔ مگر آخر اس فرمائش نے فہمائش کی صورت اختیار کر لی اور یہ مجموعہ ہم دونوں کے لئے صحیح معنوں میں بار خاطر ثابت ہونے لگا آخر خدا خدا کر کے اب چند خطوط ان کے حوالے کر رہا ہوں۔

ان مکاتیب کی تحریر کے کام سے میں فارغ ہو رہا ہوں اور اب ان کی اشاعت کا سر و سامان خود طفیل صاحب کو کرنا ہے۔ مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ میں نے یہ خطوط غبارِ خاطر والے مکاتیب کی طرح قلم برداشتہ تو نہیں البتہ دل برداشتہ ضرور لکھے ہیں اس کے باوجود اگر ان خطوط میں کسی کو کوئی خوبی نظر

آجائے تو اس کو میری کرامت نہ سمجھا جائے بلکہ مولانا آزاد کا فیض سمجھا جائے جن کے مکاتیب کی یہ "ریڑھ ماری گئی ہے"۔ پیروڈی کا ترجمہ "ریڑھ مارنا" سید محمد جعفری سے مجھ تک پہنچا ہے اور وہ راوی ہیں کہ یہ ترجمہ ماجد صاحب کا ہے بہر حال جس کا بھی ہو خوب ہے، اور اس مجموعہ کے لئے تو خوب تر۔

غبارِ خاطر اور بارِ خاطر میں کوئی مناسبت نہیں ؎
چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک

مولانا آزاد کو جو عشقِ صادق چائے سے ہے وہی پیمانِ وفا میں پان سے باندھے ہوتے ہوں یہی وجہ ہے کہ اس مجموعہ کے بیشتر خطوط میں تان آکر پان ہی پر ٹوٹی ہے اور اس کے علاوہ اس مجموعہ کے کسی خط میں وہ غبارِ خاطر والی کوئی بات کسی کو نہ ملے گی البتہ بارِ خاطر تو یہ ہے ہی۔

شوکت تھانوی

سیّد امتیاز علی تاجؔ کے نام

لاہور

۶ ر فروری ۵۱ء

سیّدنا

اس وقت آپ بے طرح یاد آرہے ہیں لکھنؤ سے
ایک عزیز بھاگ کر آئے ہیں مگر اس اہتمام کے ساتھ کہ پشتی پانوں کی ڈھولیاں بھی
لائے ہیں اور وہ چکنی ڈلی بھی جو ممّی صاحب کے کفِ دست "پہ ہوا کرتی تھی۔
دوپہر کا وقت ہے صحن میں دُھوپ کھانے نکلا تھا بیٹھ گیا پان کھانے۔
جب پُر تکلف پاندان میرے سامنے کُھل جاتا ہے تو ذہن کا وہ دریچہ بھی کُھل جاتا
ہے جس میں سے آپ کو جھانکا جا سکتا ہے۔ آج میرا پاندان ایک ایسی دُلہن کی
طرح سجا ہوا ہے جو بیوگی کی خبر پا کر عدت کے دن گزار رہی ہو کہ یکایک اُس کا

دولہا پردیس سے آجائے اور اس کو غیر متوقع طور پر اس کا سہاگ واپس مل جائے۔ کسے اُمید ہوسکتی تھی کہ اس پاندان میں لکھنؤ کے پستئی پان پھر نظر آئیں گے مگر آج اس پاندان میں پستئی پان بھی ہیں۔ کیوڑے میں بسا ہوا دودھیا کتھا بھی چھالیہ بھی وہ جس کو اہلِ ذوق "باجرہ" کہتے ہیں۔ چونا اس قدر شفاف کہ دودھ بھی اس کو اپنا آئینہ سمجھے اور کہسار مری کی برف بھی اس کے سامنے پانی پانی ہو جائے۔ سفید سڈول الائچیاں بھی ہیں اور مشکی دلانے کا تمباکو بھی۔ پھر قوام کی شیشیاں تو آپ جانتے ہی ہیں میری جان کے ساتھ ہیں۔

اس اہتمام سے پان کھا رہا ہوں اور جھوم جھوم کر گنگنا رہا ہوں ؎

پان اے عنوانِ رنگینِ لبِ لعلینِ یار
اے ذرا سے سبز پتے غازۂ روئے بہار
اے کہ تیرا رنگِ رعنا جاذبِ جذبات ہے
اے کہ تجھ سے سرخرو صبحِ تجلیات ہے

"لبِ لعلینِ یار" اور "غازۂ روئے بہار" تو آپ نے دیکھا ہی ہوگا مگر کیا واقعی "صبحِ تجلیات" بھی آپ نے دیکھی ہے؟ خدا کرے نہ دیکھی ہو تاکہ مجھ کو اپنا ایک ساتھی تو ملے۔ میں نے آج تک طلوعِ سحر۔ نور کا تڑکا۔ صبحِ صادق وغیرہ کو کتابوں میں دیکھا ہے خود دیکھنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا کہ وہ صبح کیا ہوتی ہے جس کے متعلق مدہوش ایسے شاعر نے بھی کہہ دیا ہے کہ "ظہورِ حق کے لئے" ؏

۶ اگر رسول نہ آتے تو صبح کافی تھی

اور نہ میں کبھی ایسا طالب علم رہا ہوں جس پر یہ شعر صادق آسکے کہ ؎

رات گذری نور کا تڑکا ہوا   ہوشیار اسکول کا لڑکا ہوا

طالب علمی کے زمانے میں بھی اس خاکسار کے یہاں نور کا تڑکا کبھی نو بجے سے پہلے نہ ہوا۔ طالب علمی کے بعد شاعرِ مشرق کے اس طنز کا مخاطب اپنے ہی کو سمجھا کہ ؎

کس قدر تم پہ گراں صبح کی بیداری ہے
ہم سے کب پیار ہے ہاں نیند تمہیں پیاری ہے

کاش وہ موجود ہوتے اور میں ان کو بتا سکتا کہ نیند ہمیں پیاری نہیں بلکہ نیند کو ہم پیارے ہو جاتے ہیں۔ کئی مرتبہ ارادہ کیا کہ آخر ایسی بھی کیا وضعداری، لاؤ کسی دن اندھیرے منہ اُٹھ کر تو دیکھیں کہ کیا ہوتا ہے۔ گھڑی میں الارم لگا کر سوئے مگر معلوم نہیں وہ الارم کس کے کانوں میں بجا اور کون جاگا بہر حال ہم کو کبھی اس مشاہدے کا موقع نہ مل سکا۔ خیر یہ تو ایک بے بات کی بات چھڑ گئی موضوعِ بحث اس وقت صرف پان ہے جس کے متعلق شاعر کہتا ہے ع

اے ذرا سے سبز پتّے غازۂ روئے بہار

مگر صاحب "ذرا سا سبز پتّا" تو آج اتفاق سے آگیا ہے ورنہ یہاں تو "بہت سا سبز پتّا" ملتا۔ جس پر سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ کتھا چونا کوئی بیدل کیونکر لگائے

تا وقتیکہ بائیسکل پر بیٹھ کر یہ فرض پورا نہ کیا جائے اور پھر اس "بہت سے سبز پتے" کو کھلانے کے لئے بھی بڑے کلّے ٹھلّے کے آدمی کی ضرورت ہے۔ گلوری اس کی بن ہی نہیں سکتی۔ پھپکا پھپر منہ پھاڑ کر کھانا پڑتا ہے اور کھانے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ منہ نہیں ہے بلکہ مال گودام ہے اور تو اور یہاں پان مانگنے والوں سے تنبولی یہ سوال کرتے ہیں کہ "میٹھا یا الائچی سپاری کا"؟ اب بتائیے کوئی خوش مذاق انسان کیا جواب دے اور جواب نہ دے تو کھانا پڑے وہ پان جس میں سونف بھی ہوتی ہے اور ملیٹھی کا سفوف بھی، معلوم ہوتا ہے کہ پورا زچہ خانہ اٹھا کر کھا گئے۔

آپ تو خیر تمباکو کے پان میں الائچی کے شرکت کے بھی قائل نہیں ہیں مگر میں اس باب میں مشرک واقع ہوا ہوں، تمباکو بھی کھاتا ہوں اور الائچی بھی یعنی گڑ ڈھبی کھاتا ہوں اور گلگلوں سے بھی پرہیز نہیں کرتا۔ میں پان کے معاملہ میں آپ کی رندی کا قائل ہوں کہ تمباکو بھی خوشبودار پسند نہیں کرتے۔ آپکے مراد آبادی تمباکو کے خلوص سے انکار نہیں مگر مشکی دانہ دار تمباکو کا تعطر اور قوام یا قوام کی گولیوں کی روح افزا خوشبو جو گل کھلاتی ہے اس کا بھی دیوانہ ہوں۔ خالص تمباکو خالص شکر کی ضامن ہے مگر غالب عرق گلاب میں شراب یا شراب میں گلاب ملا کر پیتے تھے۔ آپ زیادہ سے زیادہ پان کے معاملہ میں اپنے کو سادہ اور مجھ کو پُرکار تو کہہ سکتے ہیں مگر اپنے کو بے گناہ اور مجھ کو بدکار نہیں کہہ سکتے۔

آپ کا مراد آبادی تنہا کر سب کچھ کر سکتا ہے مگر وہ لعاب کیسے تیار کرے گا
جو قوام تیار کرتا ہے کہ وہ لعاب منہ میں لئے بیٹھے ہیں اور "گویم مشکل وگرنہ گویم
مشکل کی تفسیر نظر آ رہے ہیں۔ دیکھیے تاج صاحب یہاں پان کی تائید میں ایک
نکتہ اور سوجھ گیا کہ پان انسان کو نہایت کم سخن بھی بنا دیتا ہے یعنی انسان
ایک ایک بات کو پہلے سو سو مرتبہ منہ میں تولتا ہے پھر اُگالدان سے مشورہ کرتا
ہے اس کے بعد کہیں بات کرتا ہے یہ نہیں کہ زبان قینچی کی طرح چل رہی ہے،
اور یاوہ گوئی کے گل کتر رہی ہے۔

پان کے سلسلہ میں آپ کا یہ عقیدہ ہے کہ چھوٹا کھایا جائے اور کثرت سے
کھایا جائے، مگر اس عقیدے کے پس منظر میں غالباً وہی پان ہے جس کو میں
چھپر کھٹا کہتا ہوں اور جس کے آٹھ آٹھ اور دس دس ٹکڑے ہو سکتے ہیں۔ مگر اس
وقت میرے سامنے وہ بنگلہ پان ہیں جن سے غالباً "دھان پان" کا محاورہ
نکلا ہے۔ نازک نازک۔ چھوٹے چھوٹے پتے۔ گلوری بنا کر منہ میں رکھیے
تو گھل جائیں۔ ان چھوٹے چھوٹے پانوں کی خوبصورت گلوریاں جھومر میں پرو کر
خاصدان میں اگر آپ کے سامنے آ جائیں تو کثرت سے کھانے کے بھی آپ اس
خوف سے قائل نہیں رہ سکتے کہ یہ خاصدان ختم ہو جائے گا تو کیا ہو گا میرے
پاس اس وقت بنگلہ پانوں کی دو ڈھولیاں ہیں یعنی ایک دو نہیں بلکہ پورے
چار سو پان مگر دل دھڑک رہا ہے اُس وقت کے خیال سے جب یہ نہ ہوں گے

اور میں پھر اپنے بٹوے پر قناعت کر دوں گا۔

میں یا تو یہ پان کھا سکتا ہوں ورنہ اپنے کو لنڈورہ ہی بھلا سمجھتا ہوں کہ چھالیہ، خشک کتھا۔ الائچی۔ لونگ۔ تمباکو اور قوام کھا کر چونا چاٹ لوں مگر مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ جوٹ اور پٹ سن کی برادری کے پان کھاؤں جو منہ سے رسیاں بٹواتے ہیں اور جن میں لوگ مسلم الائچی ڈلوا کر جبڑوں کی ورزش کرتے ہیں۔

تقسیم ملک سے پہلے پستئی نہ سہی مگر بنارس کے سفید پان لاہور میں مل جاتے تھے۔ وہ ذرا تیز ضرور ہوتے تھے مگر یہ تیزی چنداں ناگوار نہ ہوتی تھی اور چونے کی تیزی ان کی تیزی کو رام کر لیتی تھی۔ تاج صاحب ملاحظہ فرمایا آپنے بنارس کا ذکر تھا تو بے ساختہ رام کرنے کا محاورہ قلم سے نکل گیا اور ساتھ ہی ساتھ یہ شعر بھی یاد آگیا کہ ؎

از بنارس نہ روم معبد عام است اینجا
ہر برہمن بچہ لچھمن و رام است اینجا

معاف کیجئے گا اس شعر کا یہاں کوئی محل تو نہ تھا مگر اچھا شعر اگر بے محل بھی ہو تو رنگ دے جاتا ہے۔ ہاں تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ تقسیم ملک کے بعد وہ بنارسی سفید فام پان بھی سفید فام قوم کی طرح عنقا ہو گئے اور رہ گئے یہ پان جن کو پان کی حیثیت سے کھانا تو سمجھ میں آتا نہیں البتہ روٹی کی صورت سے

کھایا جائے تو دوسری بات ہے۔

کس طرح میں آپ کو یہ بہشتی پان کھلاؤں۔ گڑھی شاہو سے ایبٹ روڈ زیادہ دور نہیں مگر یہ نازک گلوریاں وہاں پہنچتے پہنچتے مرجھا جائیں گی کمھلا جائینگی اور پان کا خون ہو جائے گا جس کو شاید آپ بھی گوارا نہ کر سکیں گے۔ لہذا آپ کے حصے کے پان بھی میں خود ہی کھا رہا ہوں اور کھا کھا کر آپ کو یاد کر رہا ہوں معطر، لطیف اور خنک گلوریاں۔ محسوس ایسا ہوتا ہے گویا پان نہیں بلکہ پان کا تصور چبا رہا ہوں گلوری منہ میں جاتی ہے اور غائب ہو جاتی ہے۔ روح ہی روح ہے مادّے کا پتہ نہیں۔ آپ پان کے پہنچے ہوئے عارف ہیں اور غالباً اس کے قائل ہوں گے کہ پان کے معاملہ میں روحانیت مقدم ہے مادّیت کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔

شوکت تھانوی

۲

لاہور

۸ر فروری ۵۱ء

سیدنا!

حسبِ معمول پاندان سامنے کھلا ہوا ہے۔ ایک گلوری کھا چکا ہوں۔ دوسری کے لئے نیت میں فتور پاتا ہوں۔ اور یہی وقت ہے آپ کے یاد آنے کا کہ آپ ہوتے تو اپنے ہاتھ سے آپ کے لئے بھی پان بناتا اور پیش کرتا کہ ؎

برگ سبز است تحفۂ درویش

اس تحفہ کی قدر کچھ آپ ہی کر سکتے ہیں اور سچ پوچھئے تو آپ کو پان کھلا کر جی بھی خوش ہوتا ہے کہ یہ پان اس کو کھلایا گیا ہے جو پان کو پان سمجھ کر

کھائے گا۔ یوں کھانے کو تو اب کون نہیں کھاتا ؎

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

مشاعروں میں پان چلتے ہیں۔ دعوتوں میں کشتیاں بھر بھر کر پانوں کا بیڑہ غرق کیا جاتا ہے اور ہر سینما ہال کے در و دیوار شہادت دیتے ہیں کہ یہاں پانوں کا خون ہُوا ہے۔ مگر کچھ نہ پوچھئے کہ ناجنسوں کے منہ میں پان دیکھ کر کس قدر عبرت ہوتی ہے۔ یہ لوگ ہر قسم کے خس و خاشاک کو پان کا نام دے کر خود تو سرخرو ہو جاتے ہیں مگر پان کی بدنامی اور رسوائی میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھتے۔ پان کھا لینے کے بعد وہ کائنات کو ایک عظیم الشان اُگالدان سمجھتے ہیں جس میں ہر طرف خون تھوکتے پھرتے ہیں۔ لہلہاتے ہوئے سبزہ زاروں پر۔ پھولوں کے گملوں میں۔ شفّاف فرش پر۔ در و دیوار پر غرض ہر طرف پیک کی پچکاریاں نظر آتی ہیں اور حد یہ ہے کہ خود بدولت کی سفید پوشی خطرے میں پڑ کر رہ جاتی ہے۔ ان مناظر کو دیکھنے والے سارا الزام غریب پان کے سر تھوپ دیتے ہیں اور بدنام ہوتے ہیں پان کھانے والے۔ کاش ان بدنام کرنے والوں کو معلوم ہوتا کہ یہ کُل پان کھانے والے نہیں کھلاتے بلکہ بد صناعیاں وہ اناڑی دکھاتے ہیں جو پان کھانے کو تو کھا لیتے ہیں مگر اس کے بعد ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اب کیا کریں اور جو کچھ وہ کرتے ہیں وہ یہی سبب

کچھ ہے جس کو پان کھانے والوں سے منسوب کیا جاتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ پان کھانے کے لئے بڑے توازن کی ضرورت ہے اور بڑی عالی ظرفی درکار ہے۔ عالی ظرفی سے مراد یہ نہیں ہے کہ آدمی اپنا اگالدان خود بن جائے ہر چند کہ خود اگالدان بھی ظرف ہے مگر میں اس وقت نہایت سنجیدہ بحث کر رہا ہوں۔ تاج صاحب آپ کو تو معلوم ہی ہوگا کہ اہلِ ذوق موقع اور محل کی مناسبت سے پان اور اس کے لوازم استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً گھر میں ہیں اور سامنے بڑا سا اگالدان موجود ہے تو تمبا کو علی الحساب کھا لیتے اور قوام کی مقدار بڑھا دینے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں کہ اگر "بادہ" تھوڑا بہت بہ ظرفِ قدح خوار اس سے بڑھ ہی گیا تو اگالدان میں چھلکایا جا سکتا ہے۔ مگر سرِ راہ یا کسی محفل میں ہمیشہ ہم لوگ احتیاط سے کام لیتے ہیں کہ تمبا کو اتنا ہی استعمال کریں جس کو واپس کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہو اور خواہ مخواہ کی کلکاریاں نہ کرنا پڑیں۔ ہم لوگ بے داغ سفید لباس بھی پہنتے ہیں اور پان کے دھبوں سے دامن بھی بچاتے ہیں۔ ۔۔۔

اس حسنِ برق وش کے دل سوختہ وہی ہیں
شعلوں سے جو کھیلیں دامن کو بھی بچائیں

خیر یہ تو ایک دوسری ہی بحث خواہ مخواہ چھڑ گئی۔ میں تو یہ عرض کر رہا تھا کہ میری زندگی کا سب سے المناک وقت وہ ہوتا ہے جب مجھ کو شبہ ہو جاتا

پڑے کہ اپنے پاندان سے اور اپنے ہاتھ سے پان بنا کر کسی ایسے ناجنس کو کھلانا پڑے جو پان کھانے کے آداب سے بھی واقف نہ ہو۔ اس قسم کے موقعوں پر مجھ کو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے گویا میں کوئی گناہ کر رہا ہوں اور میرا ضمیر اس قسم کے موقعوں پر ضرور جاگ اُٹھتا ہے اور پکار پکار کر کہتا ہے کہ ؎

قریب ہے یار روزِ محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر
جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستین کا

اور اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ میں اس لہو کو ان کی آستین پر دیکھ لیتا ہوں اور دل دھک سے ہو جاتا ہے کہ یہ مقتول گلوری میدانِ حشر میں اپنے خونِ ناحق کا مجھ پر دعوےٰ کرے گی اور سوال ہو گا مجھ سے کہ اے احسان فراموش بندے کیا ہم نے تجھ کو پان ایسی نعمت سے اسی لئے سرفراز کیا تھا کہ تو ان کور ذوق احباب کو پان کھلائے جن کو یہ بھی نہیں معلوم کہ پان ترکاری ہے یا غلہ۔

چنانچہ بھائی جان۔ کرتا یہ ہوں کہ مہمانوں کے لئے بازار سے پان منگاتا ہوں اور خود دستِ خود دہانِ خود کا قائل ہوں۔ سوائے آپ کی ڈبیا کے اور کسی کا پان آپ نے کھاتے نہ دیکھا ہو گا۔ جو لذت خود اپنے بنائے ہوئے پان سے حاصل ہوتی ہے وہ کہیں اور نہ مل سکی۔ میں پان اور دستخط بس ان دو ہی چیزوں میں "بقلم خود" کا قائل ہوں۔ دعوتوں میں جاتا ہوں۔ محفلوں میں بیٹھتا ہوں مشاعروں

ہیں راتیں کاٹتا ہوں۔ لمبے لمبے سفر کرتا ہوں مگر پان اپنا ہی کھاتا ہوں اور جب پان ختم ہو جائیں تو بٹوے پر قناعت کرتا ہوں مگر میرے ذوق کو ہر جگہ اور ہر ہاتھ کے پان سے تسکین نہیں ہو سکتی۔ اور نہ کبھی بیوی یا کسی خاتون سے محبت نے اس دیوانگی کی شکل اختیار کی کہ اُن محترمہ کے ہاتھ کی گلوری خواہ مخواہ اچھی لگنے لگتی۔ تاج صاحب میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر مثنوی زہر عشق کا میں ہیرو ہوتا اور سوداگر صاحب کی صاحبزادی محترمہ مہ جبین مجھ سے یہ کہتیں کہ ؎

پان کل کے لئے لگاتے جائیں
یاد اپنی تمھیں دلاتے جائیں

تو میں بہ ادب اُن سے یہی عرض کرتا کہ یاد دلانے کا اور کوئی طریقہ اختیار کیجئے پان تو میں اپنے لئے خود ہی بناتا ہوں اور بناتا رہوں گا۔ اور رخصت کے وقت نظام کو جو گلوری دی گئی تھی۔ ع

منہ پھیر کر اُدھر کو اِدھر کو بڑھا کے ہاتھ

وہ گلوری میں بخدا کبھی نہ لیتا خواہ زندگی بھر اُن کا منہ اُسی طرف پھرا رہتا اور ہاتھ اسی طرف بڑھا رہتا۔

صاحب میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک اصل نسل کے پان کھانے والے کے لئے کوئی دوسرا شخص کیونکر پان بنا سکتا ہے اور میری سمجھ میں وہ پان کھانے والے کبھی نہ آئے جن کے ذوق کو دوسروں کے بنائے ہوئے پان تسکین دے

دیتے ہیں۔ بالکل اسی طرح اگر کوئی صاحب میرے بنائے ہوئے پان کی تعریف کرتے ہیں تو آگ ہی لگ جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ بھی داد نہ دیں۔ قصہ تو یہ ہے کہ یہ معاملہ۔ ع

تحسینِ ناشناس وسکوتِ سخن شناس

کے ذیل میں آتا ہے اور واقعہ بھی یہ ہے کہ جس وقت میں پان پر کتھا اور چونا لگاتا ہوں تو التزام وہی ہوتا ہے جو شاعر دونوں مصرعوں کی ترتیب اور سجاوٹ میں پیشِ نظر رکھتے ہیں کہ نوک پلک سے درست ہے کوئی رکن بڑھنے یا گھٹنے نہ پائے۔ ایطاء نہ خفی ہو نہ جلی۔ وزن سے گرنے نہ پائے۔ دونوں مصرعوں میں ربط ایسا ہو کہ شتر گربہ پیدا نہ ہو۔ میں نہ اس طرح پان لگاتا ہوں جس طرح آزاد نظمیں کہی جاتی ہیں کہ ذرا سے چونے پر بہت سا کتھا لیپ دیا۔ دکھ کر نہ اس طرح پان بناتا ہوں جس طرح فلمی گانے لکھے جاتے ہیں کہ ؎

کتھے جا ــــ پیچھے رہا ہے چونا مرا اس کو جا کر لا

مگر معاف کیجئے گا یہ فلمی مثال شاید آپ کو ناگوار ہو۔ آپ ٹھہرے فلمی اساتذہ میں سے۔ اور آپ کی فلمی ہمہ گیری مسلّم مانی جاتی ہے۔ بلکہ ان ماننے والوں میں ایک میں بھی ہوں۔ اور نہ کیسے مانوں گا۔ ع

حقیقت خود کو منوا لیتی ہے مانی نہیں جاتی

کہانیاں آپ لکھیں۔ مکالمے آپ لکھیں۔ اور ڈائرکشن آپ دیں۔ مگر تاج صاحب

آپ کبھی سجدۂ شکر بھی ادا کرتے ہیں کہ آپ کو خدا نے فلمی شاعر بننے سے بال بال بچا لیا ۔ فرض کر لیجیے کہ آپ کی صلاحیتوں میں ایک صلاحیت یہ بھی پیدا ہو جاتی تو آپ کیا کر لیتے ۔ تخلص موجود ہی تھا ۔ فلمی شغف بھی کہیں سے لانا نہ تھا صرف ایک دیا سلائی کی ڈبیہ درکار ہوتی کہ اس کو بجا بجا کر ٹکڑے ملا رہے ہیں ۔ ممکن ہے آپ اس کو معمولی بات سمجھ کر ٹال جائیں مگر میں درگاہِ رب العزت میں آپ کی طرف سے سجدۂ شکر ادا کروں گا کہ اُس نے آپ کو فلمی شاعری کی توفیق سے محفوظ رکھا ۔ حالانکہ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ کچھ ہی دنوں میں یہ فلمی شاعری بھی ہمارے لٹریچر میں داخل ہو جائے گی اور حوالے دیئے جائیں گے کہ ایک فلمی شاعر کہتا ہے کہ ؎

ساجن کی بات پہ غصہ جو آ گیا ۔۔۔ زلفوں کا بادل گالوں پہ چھا گیا
ابھی ابھی دن تھا ابھی ابھی رات ہے ۔۔۔ پہلی ملاقات ہے پہلی ملاقات ہے

اس پہلی ملاقات پر اُردو کی پہلی ریڈر نہ جانے کیوں یاد آ گئی ۔ جی چاہتا ہے کہ اس موضوع پر بھی کچھ باتیں ہو جائیں مگر پانوں کی صافی خشک ہو گئی ہے اور چھجے کی کلبیا پہ دھوپ پڑ رہی ہے ۔ پاندان بند کر رہا ہوں اور یہ خط یہیں پہ ختم کر رہا ہوں ۔ یار زندہ صحبت باقی ۔

شوکت تھانوی

۳

لاہور اور قصور کے درمیان

۱۱ فروری ۵۱ء

سیدنا!

میں اس وقت سفر میں ہوں۔ بلکہ سفر کا قصور وار
ہوں اس لیے کہ قصور جا رہا ہوں اور ایک ایسی سواری میں جا رہا ہوں جو
نہ موٹر ہے نہ ریل۔ نہ بیل گاڑی ہے نہ اونٹ گاڑی۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی
موٹر اور ریل کی سول میرج نے یہ سواری پیدا کی ہے جس پر میں سفر کر رہا ہوں۔
اس کو ڈیزل کار کہتے ہیں اور اس پر سفر کرنے والا ہی غالب کو داد دے سکتا
ہے کہ کیا خوب مصرعہ مرحوم کہہ گئے ہیں۔ ع۔

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

یہ ڈیزل کار ریلوے کے محکمہ نے اپنی ترقی پسندی کے اظہار کے طور پہ جاری کی ہے کہ اس میں سفر کرنے والے سب ایک ہی سطح پہ نظر آتے ہیں نہ کوئی بلند نہ کوئی پست - نہ تیسرا درجہ ہے نہ دومیانہ، نہ دوسرا نہ پہلا۔ بس ایک ہی درجہ ہے خواہ اُس کو کوئی درجہ سمجھ لیجئے، اور اگر اس جھگڑے سے بچنا ہی منظور ہو تو اس کو ایک حمّام سمجھ لیجئے جس میں سب کے سب ایک ہی حالت میں نظر آتے ہیں۔ میرے ہمنشینوں میں سے ایک صاحب اپنی بیگم کے برقعہ میں منہ ڈالے غالباً کوئی سیاسی گتھی سلجھا رہے ہیں اور ان کا شیر خوار بچہ مدد رو کر دوسرے مسافروں کو درسِ عبرت دے رہا ہے ۔۔

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

کہ "زنہار" اگر تمھیں اولاد کی تمنا ہے تو میرے والدین کی طرح اپنے کو "ماضی تمنائی" بنانے سے بچانا۔ دُنیا کی آبادی بڑھانا عیب نہیں مگر اس بہانے سے دُنیا کے مصائب میں اضافہ نہ کرنا۔ ایک اور شریکِ سفر منہ ہی منہ میں میرے منہ در منہ پان چبا رہے ہیں۔ میں اِن سے پناہ مانگ رہا ہوں کہ اگر خدانخواستہ ذرا بھی راہ و رسم کی نوبت آئی تو یہ حضرت یا تو اپنا نامعقول پان مجھ کو پیش کریں گے یا خدا اُس وقت سے بچائے جب یہ میرا پاندان دیکھ کر مجھ سے پان طلب کریں گے۔ تیسرے صاحب، وہ ہیں جن کے تیور سے سلام

ہو رہا ہے کہ یا تو قصور پہنچتے ہی اقدام قتل کریں گے یا خودکشی اور ایک امکان یہ بھی ہے کہ شاید بیوی کو طلاق دینے کے لئے یہ سفر کیا ہو۔ اپنی جان سے بیزار اور دوسروں کی جان کے لاگو نظر آ رہے ہیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ایک کرب کی سی کیفیت ان بیچارے پر طاری ہو جاتی ہے اور زیر لب معلوم نہیں کوئی وظیفہ پڑھتے ہیں یا کسی کو گالیاں دیتے ہیں۔ ان حضرات کے ہاتھ میں آج کا وہ اخبار ہے جو میں صبح ہی پڑھ چکا ہوں۔ اس اخبار میں بھی ایسی کوئی بات تو ہے نہیں جس پر یہ اس قدر ناراض ہوں مثلاً ایک خبر تو یہی ہے کہ مصر کے متعلق برطانیہ اور امریکہ مشترکہ قرارداد پیش کریں گے۔ اگر اس خبر پر ہمارے یہ ہم سفر ناراض ہیں تو وہ خود ہی مسئلہ مصر کا کوئی حل تجویز کریں۔ ایک خبر پر البتہ شبہ ہوتا ہے کہ شاید اس کا تعلق آپ ہی سے ہو کہ لاہور کے بہت سے امیدواروں نے اپنے کاغذات نامزدگی واپس لے لئے ہیں۔ کیا عجب کہ یہ حضرت بھی ان ہی میں سے ہوں۔ مگر غالباً یہ قصہ بھی نہیں ہے اس قسم کے لوگ "امیدوار" تو ہوا ہی نہیں کرتے۔ "دست بردار" البتہ دیکھے اور پائے گئے ہیں۔ ہاں صاحب ایک خبر اور بھی ہے جو ان بزرگ پر چسپاں ہو سکتی ہے کہ سارے پاکستان میں مردم شماری شروع ہو گئی اور کراچی میں سب سے پہلے خواجہ ناظم الدین صاحب کے نام کا اندراج ہوا۔ ممکن ہے کہ اس خبر سے کچھ پریشان ہو گئے ہوں یہ بیچارے کہ خیر اب تک تو ایک بھرم قائم تھا

مگر مردم شماری میں کھلم کھلا یہ کہہ کر اپنے کو شامل کرا سکیں گے۔ نہیں صاحب یہ بھی کچھ دل کو لگتی بات نہیں ہے۔ بہر حال جو کچھ بھی ہو اللہ تعالیٰ ان پر رحم فرمائے ——— لیجئے صاحب یہ وبا سلائی کی ڈبیہ جس میں ہم سفر کر رہے ہیں چلتے چلتے رینگنے لگی۔ ٹھیک ہے۔ اسٹیشن آگیا ہے۔ تلوج صاحب ملاحظہ فرمایئے کیا نام بھی اسم مبارک پایا ہے اس اسٹیشن نے بھی یہ "جتیا بگا" معلوم نہیں ہمارا اسٹیشنوں کے نام کون صاحب رکھا کرتے ہیں۔ اور ان ناموں کی آخر وجہ تسمیہ کیا ہوتی ہے صاحب عجیب عجیب نام ہوتے ہیں اور یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ یہ نام کس زبان میں رکھے گئے ہیں مثلاً اسی راستہ میں ایک اسٹیشن کا اسم مبارک ہے "کانا کاچھا" مجھ کو اپنی نا سمجھی کا اعتراف ہے کچھ آپ کی سمجھ میں آتی ہے اس کی وجہ تسمیہ جس قدر غور کیجئے گا طبیعت الجھے گی۔ چھوڑیئے اس قصہ کو اور ایک تازہ گلوری کھا لیجئے کہ دفع شر کا آزمودہ نسخہ ہے۔ تلوج صاحب میرا ہاتھ سفری پاندان کی طرف بڑھ رہا ہے اور ذہن میں اکبر الہ آبادی کا ایک شعر ابھر آیا ہے۔ ——

خاصدان آگے بڑھا کر میری باتوں پہ کہا

آپ کیوں جان مری کھا رہے ہیں پان تو ہیں

صاحب استغفراللہ سخت کوفت ہوئی پاندان کھول کر۔ کتھے کی کلھیا الٹ گئی ہے اور سارا پاندان موسلا دھار بارش کے بعد لاہور کے اندرون

موچی گیٹ کا منظر پیش کر رہا ہے۔ اب میں پان نہیں کھا سکتا۔ پان کے سلسلہ میں میری نفاست پسندی اس کثافت کی تاب نہیں لا سکتی۔ میں پاندان اور اُگالدان کے فرق کو سمجھتا ہوں اور اس مساوات کا قائل نہیں کہ یہ امتیاز اُٹھ جائے۔ اپنے بٹوے کی طرف واپس جاتا ہوں۔ مجبوری ہیں تیمم بھی جائز ہے۔ دیکھئے تاج صاحب بٹوے کے خشک لوازم کی رعایت سے تیمم کس قدر برمحل ترکیب ہے۔ میں اکثر غور کرتا ہوں کہ آخر انگریزوں پر یہ کیا خدا کی مار تھی وہ پان نہیں کھاتے تھے۔ کاش کھاتے ہوتے تو ہم کو ایک یہی فائدہ پہنچتا کہ سگرٹ کی طرح پان بھی پُرتکلف ڈبیوں میں بند بازار میں مل سکتا اور نہایت نفاست کے ساتھ پیٹنٹ ادویہ کی طرح خوبصورت پیکنگ میں دستیاب ہوتا۔ پان کے لئے بھی نت نئے سائنٹیفک تجربے کئے جاتے اور اس پاندان کے جھگڑے سے یا تو نجات مل جاتی یا پاندان بھی کچھ ٹائپ رائٹر کی قسم کا بن چکا ہوتا کہ پان کا پتہ رولر پر لپیٹا۔ چونے کا بٹن دبایا چونا لگ گیا۔ کتھے کا بٹن انگلی سے دبایا اور کتھا لگ گیا۔ اسی طرح چھالیہ۔ تمباکو۔ الائچی۔ قوام سب کے بٹن ہوتے اور گھنٹی بجتے ہی ایک خوبصورت سڈول سی گلوری اس مشین سے نکل آتی۔ اب ذرا اس تصور کو وسعت دیجئے تو بہت سے گوشے اُٹھ سکتے ہیں مثلاً یہ کہ جب پاندان ٹائپ رائٹر کی قسم کا ہوتا تو اس مشین پر پان بنانے والے بھی ماہرینِ فن سے ٹریننگ حاصل کیا کرتے

اور جس طرح اسٹینوٹائپسٹ کی اسپیڈ دیکھی جاتی ہے اسی طرح پان بنانے والوں کی رفتار بھی دیکھی جاتی کہ امیدوار کی رفتار کیا ہے۔ یعنی کتنی گلوریاں کتنی دیر میں بنا لیتا ہے۔ گلوری کو غالباً گیپ سول کہا جاتا اور یہ گیپ سول کھٹا کھٹ اس مشین سے نکلتے رہتے۔ ظاہر ہے کہ سگرٹ اور سگار کی طرح ان کی بھی قسمیں ہوتیں۔ قیمتوں میں فرق بھی ہوتا مگر آسانی کتنی پیدا ہو جاتی۔ تقریباً وہی آسانی جو پیچواں کے بجائے سگرٹ سے پیدا ہو گئی ہے آپ کہہ سکتے ہیں کہ پیچواں اور سگرٹ کا کیا مقابلہ مگر آپ اس سے انکار نہیں کر سکتے سگرٹ رواج پا گئی ہے اور حقہ کے عذاب سے یاروں نے یہ کہہ کر نجات حاصل کر لی ہے کہ۔ ع۔

حقا کہ با عقوبتِ دوزخ برابر است

کیا عجب ہے کہ ہم لوگوں کو ان پیٹنٹ پانوں کا کوئی نمونہ پسند ہی آجاتا مگر فی الحال تو میں اپنے بٹوے ہی کو پان کا نعم البدل سمجھ رہا ہوں معلوم نہیں آپ کو بٹوے سے کیوں اختلاف ہے۔ غالباً آپ گھبراتے ہیں کہ یہ جھول کون پالے۔ دیکھئے لطف دے گیا یہ محاورہ بھی بٹوہ خود ایک چھوٹی سی جھولی ہوتا ہے اُس کے لئے جھول پالنا بھرپور محاورہ ہے۔ مگر تاج صاحب یہ جھول پالنا نہیں ہے اپنے ذوق کو تسکین دینے کی ایک سبیل ہے۔ بدقسمتی سے پان ہم نجیب الطرفین نہیں کھا سکتے اور بغیر پان کے نجابت خطرے میں نظر

آتی ہے مجبوراً یہ بٹوے کی ترکیب نکالی ہے۔ باریک کٹی ہوئی چھالیا ہو۔ راکھ پر خشک کیا ہوا دُودھیا کتھا ہو، چاندی کی ایک ڈبیا میں تمباکو ہو۔ دوسری میں شفاف چونا اور تیسری میں قوام۔ بھری ہوئی الائچیاں ہوں اور تیز لونگیں۔ پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ کبھی جو آپ کو پان یاد آئے۔ بقول شاعر ؎

تم ہوئے گلرنگ ہو میں ہوں لبِ جو ہو
پھر ابرِ بہاری جو نہ برسے تو نہ بہسے

لیجئے میں نے اپنے مخملی بٹوے سے اپنے لئے خوراک بنالی۔ بٹوہ بند کر دیا اور ڈبیاں کھول دیں۔ میرے جان سے بیزار ہمنشین اس طرح گھور گھور کر ان لوازم کو دیکھ رہے ہیں گویا میں مداری ہوں اور کوئی کرتب دکھانے ہی والا ہوں غالباً ان کا خیال ہے کہ ان ڈبیوں سے انڈے نکلیں گے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ انڈے نکلنے سے پہلے ہی ہم لوگ اس ڈبے سے نکل جائیں گے۔ ڈیزل کار کی رفتار سست پڑ گئی اور اب کی قصور ہی ہے۔ جی ہاں قصور آ گیا اور مسافروں نے اپنی اپنی گٹھڑیاں سنبھالنا شروع کر دیں مگر میں اس پاندان کو کیونکر سنبھالوں۔ جی چاہتا ہے کہ یہ پاندان ان ہی جان سے بیزار ہمسفر کی خدمت میں پیش کر دوں جو غالباً اسی قسم کے کسی پاندان کے بنا ہوا پان کھا کر چلے تھے کہ دہانِ مبارک تو بٹوہ بنا ہوا ہے اور خود بیچارے بدستور اسی کرب میں مبتلا ہیں جس کرب نے راستہ بھر ان کے

سائنس تو خدا جانے کیا سلوک کیا ہے مگر دیکھنے والوں کو بھی پریشان کر دیا۔ مگر نہیں ہیں اس پاندان کو اس کی اصلیت یاد دلاؤنگا اور اس کی اصلاح کرونگا۔ تاج صاحب خدا کے لئے کہیں سے اچھے پانوں کا انتظام کیجئے ورنہ زندگی کا آخری سہارا صرف جوڑہ رہ جائے گا۔

شوکت تھانوی

حفیظ جالندھری کے نام

لاہور
۱۵ فروری ۴۱ء

حفیظ صاحب !

آج طبیعت سخت چڑچڑی ہے۔ زندگی
سے دل بیزار سا ہو رہا ہے۔ موسم سے زیادہ طبیعت اور طبیعت سے زیادہ
موسم خراب ہے۔ اور آپ یاد آ رہے ہیں۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ اس
بے کیفی میں آپ کی یاد ستا رہی ہے۔ مگر اس کو سوائے اتفاق کے اور کیا
کہا جا سکتا ہے۔ آپ کے ایک ہمنام شاعر کا شعر ہے جو اس وقت آپ کے ساتھ
ہی ذہن میں آیا ہے۔ ؎

تری یاد یوں دل میں آئی کبھی   کوئی جس طرح اتفاقاً ملے

مگر میں اتفاق کے محض اتفاق ہونے کا کبھی قائل نہیں رہا۔ میرے خیال میں ہر اتفاق کی بھی ایک تقریب ہوتی ہے اور اس وقت آپ کا یاد آنا یقیناً اُس بے کیفی کی وجہ سے ہے جو آج مجھ پر خدا جانے کیوں طاری ہے اور آپ پر عموماً خدا جانے کیوں طاری رہا کرتی ہے۔ حفیظ صاحب! آج سے زیادہ مناسب موقع پھر شاید نہ مل سکے کہ میں آپ سے آپ کی اس مستقل بے کیفی پر تبادلۂ خیال کر دوں۔ کئی مرتبہ پہلے بھی ارادہ کیا کہ پوچھوں تو سہی کہ آخر آپ اس قدر ناراض کیوں ہیں اور کس سے ناراض ہیں۔ مخالفوں اور بدخواہوں سے ناراض ہونا یقیناً کوئی بیماری نہیں یہ اور بات ہے کہ صحت کی علامت یہ ہے کہ مخالفین سے بھی خندہ پیشانی برتی جائے مگر آپ کو تو اپنے نیازمندوں سے بھی کچھ شکایت معلوم ہوتی ہے اور حفیظ ان ہی کا نظر نہیں آتا جو حفیظ کو اپنا سمجھتے ہیں اور آپ کا انداز کچھ ایسا ہو کر رہ گیا ہے کہ جیسے۔ ع۔

رہزن کا اب گماں ہے ہر اپنے ہمنشیں پر

ہماری شاعری میں دوستی کو دشمنی کی آخری منزل سے تعبیر کیا گیا ہے اور کہنے والے تو یہاں تک کہہ گئے ہیں کہ ؎

وہ کس خطا پہ ہوئے دشمنی کو آمادہ
اُنھیں تو میں نے کبھی دوست بھی نہ جانا تھا

مگر اسی طرح کہنے والوں نے یہاں تک کہا ہے کہ ؎

اے دوست کسی ہمدم دیرینہ کا ملنا
بہتر ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر سے

اب سمجھ میں نہیں آتا کہ ان دونوں میں سے کونسی بات دُرست ہے خود آپ کا ایک شعر ذہن میں موجود ہے مگر اُس کا پہلا مصرعہ حافظے میں چھپتا پھر رہا ہے جس کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ ہر دوست سے مجھ کو یہ کہہ کر دغا دی کہ ع

اے دوست تجھ سے ترکِ وفا کا گماں نہیں

لائیے آپ کے اس شعر پہ ایک تازہ پان کھالوں ۔ ہر چند کہ خاصدان میں گلوریاں بھی موجود ہیں مگر میں پاندان سے تازہ پان بنا کر کھاؤں گا تاکہ آپ کا یہ باسی شعر دماغ میں تازہ ہو سکے ۔ حفیظ صاحب کاش آپ بھی پان کھاتے ہوتے اور اپنی بے کیفیوں کو گلوریوں سے بہلانا اور بھلانا جانتے ہوتے مگر آپ کو تو جب غصہ آتا ہے اور احباب کی طرف سے دل جلتا ہے آپ سگریٹ پر سگریٹ کچھ اس انداز سے پیتے ہیں کہ ؎

شعلۂ آہ سے اک آگ لگاتا ہے مجھے
خود بھی جلتا ہوں قفس کو بھی جلاتا ہے مجھے

لیجیئے میں نے نہایت شاداب گلوری ابھی بنائی اور ابھی کھالی ۔ اب

ہیں آپ سے آپ کی بے کیفی کے موضوع پر جب تک کہیئے بحث کر سکتا ہوں
یہ پان کھاتے ہی دور کی سوجھی اور ذہن میں ایک گوشہ اور اٹھ گیا حفیظ صاحب
احباب سے آپ کی بدظنی کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ آپ حفیظ جالندھری
سے خانصاحب حفیظ جالندھری ہوئے، ابوالاثر خانصاحب حفیظ جالندھری
ہوئے۔ ابوالاثر فردوسیٔ اسلام خان بہادر حفیظ جالندھری ہوئے پبلسٹی
پبلسٹی ڈائرکٹر حفیظ جالندھری ہوئے۔ مگر۔ ع

اک اہلِ عشق ہیں کہ جہاں تھے وہیں رہے

اور ان "اہلِ عشق" نے آپ کو بھی وہی سمجھا جو اوّل دن سمجھا تھا۔ وہی بے تکلفی۔
وہی گھر کی مرغی کو دال برابر سمجھنے کی کیفیت۔ بلکہ آپ کی ترقیوں پہ ایک خندۂ
زیرِ لب۔ حفیظ صاحب دیکھئے میں نے تبسّم زیرِ لب نہیں کہا ہے۔ خندۂ زیرِ لب
وہ ہوتا ہے جو ہوتا تو ہے زیرِ لب مگر ایک گونج بھی ہوتی ہے اس کی۔ اگر
آپ کو احباب سے اس "رشک" اور اس "حسد" کی شکایت ہے تو میرے
محترم دوست صبر کیجئے۔ اس قسم کے احباب صرف آپ کے نہیں ہیں ہر قوم میں
اس قسم کے لوگ ہوتے ہیں جو اپنے کسی ہمنشین کو مسند نشین دیکھ کر عقیدت کے آنسو
نہیں برسا سکتے بلکہ ان کا یہی طرزِ عمل ہوتا ہے۔ وہ اپنے ترقی کرنے والے دوست
کو اپنا رقیب سمجھتے ہیں اور رقابت کی ہلکی ہلکی آنچ میں خود جلتے رہتے ہیں۔ ان
کو جلنے دیجئے آپ کیوں جلیں۔ آپ کیوں اپنی صحت پہ اثر لیں۔ آپ کو خدا نے

عزت دی ہے۔ دولت دی ہے۔ مقبولیت دی ہے اگر دوست نہیں دیئے تو کیا ہوا سب ہی کچھ ایک ہی آدمی کو تو نہیں مل جاتا۔ شکر کیجئے کہ آپ محسود ہیں حاسد نہیں۔ اور اگر آپ محسود کے ساتھ ساتھ حاسد بھی بننا چاہتے ہیں تو یہ تو ایک قسم کی "ذخیرہ اندوزی ہوئی" جو آپ کے شایانِ شان نہیں۔

میں نے نہایت عبرت سے آپ کا ایک تازہ شعر سنا ؎

مسلمانوں کا خادم تھا لیاقت
مسلمانوں نے اس کو مار ڈالا

سنانے والے کا مطلب یہ تھا کہ ملاحظہ ہو گویا یہ بھی شعر ہے۔ میں اور کچھ تو نہ کہہ سکا صرف یہ عرض کیا کہ سادہ شعر کی خوبی ہی یہ ہے کہ سنئیے تو آسان محسوس ہو اور کہیئے تو لوہے لگ جائیں۔ اس شعر میں کیا سب سے بڑی خوبی یہ نہیں ہے کہ اس کو مشرقی اور مغربی پاکستان میں یکساں طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ حفیظ صاحب! یہ بات میں سب سے نہیں کہہ سکتا صرف آپ سے عرض کر سکتا ہوں کہ بھائی میرے اس وقت ملت کو ایسے شاعروں کی ضرورت ہے جو نہ اُردو میں شعر کہیں نہ بنگلہ میں بلکہ ایک ایسی زبان میں شعر کہیں جس میں زبان کا سوال ہی پیدا نہ ہو اور آپ کا یہ شعر یقیناً ایک ایسی زبان کا شعر ہے جس کے لئے اُردو یا بنگلہ کی لغت گھولنے کی ضرورت نہیں۔ بسب

ہی سمجھ سکتے ہیں جو نہ سمجھیں وہ متعصب ہیں۔ ان سے خدا سمجھے۔

میرے بھائی۔ اس قسم کے شعر کہنے کے لئے خدا آپ کو کم سے کم اس وقت تک ضرور زندہ رکھے جب تک اُردو زندہ ہے اور اُردو یقیناً اس وقت تک زندہ رہے گی جب تک آپکے یہ شعر زندہ ہیں۔ ہم کو اس وقت شاعری کی زندگی نہیں چاہیئے اُردو کی زندگی درکار ہے۔

حفیظ صاحب! کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ زندہ رہنے کی ایک مرتبہ پھر کوشش شروع کر دیں۔ احباب کے علاوہ آپ کو ملّت سے بھی شکایت ہے۔ پاکستان سے بھی شکایت ہے۔ اور یہ شکایتیں ہر ذی حس انسان کو ہوتی ہیں مگر آپ کی طرح کوئی بھی ان شکایات کو اپنے اُوپر طاری کر کے اعصابی شکایات نہیں بناتا۔ اگر خود شکایات کا مجموعہ بن گئے تو اصلاح کون کریگا۔ آپ کو ملّت کی اصلاح کرنا چاہیئے نہ کہ ملّت آپ کی اصلاح کی طرف متوجہ ہو جائے۔

آپنے ملّت کے لئے جو کام کئے ہیں وہ دوسروں سے شاید پوشیدہ ہوں مگر مجھ پر روشن ہیں۔ کچھ دن ہوئے رضاکاروں کی پریڈ دیکھ رہا تھا اور آپ کا یہ مصرعہ ذہن میں گونج رہا تھا کہ۔ ؎

قدم اُٹھا۔ قدم اُٹھا۔ قدم اُٹھا کے چل۔ قدم بڑھا کے چل

میں چاہتا ہوں کہ خود آپ بھی بغیر قدم اُٹھائے چلنا چھوڑ دیں۔ زندگی

کو زندگی کی طرح بسر کیجیئے۔ زندگی کو یہ زحمت نہ دیجیئے کہ وہ آپ کو بسر کرے۔
آپ کو اگر نہیں معلوم تو مجھ سے سُن لیجیئے کہ ملّت کو شاعر کی ضرورت نہیں۔
شاعر بہت سے ہیں جو شاعری کر رہے ہیں۔ ملّت کو حفیظ کی زندہ حفیظ کی ضرورت
ہے۔ لہذا اپنے میں زندگی کی رُوح پھونکیئے اور زندگی سے بیزاری چھوڑ دیجیئے
لیجیئے پاندان پھر اپنی طرف متوجہ کر رہا ہے۔ بقیہ بے کیفی ایک تازہ گلوری
دُور کر دے گی۔

شوکت تھانوی

۲

گڈھی شاہو۔ لاہور

۲۲؍ فروری ۱۹۵۱ء

حفیظ صاحب!

راولپنڈی سے کچھ خبریں تیز تیز کر لاہور پہنچ رہی ہیں اور عجیب مدّوجزر پیدا کر رہی ہیں۔ روایت ہے کہ شاد یسخن کو واقعی اب بازی کا شوق پیدا ہو گیا ہے۔ آپ کا ایک شعر بلکہ مطلع اس وقت بیساختہ یاد آ رہا ہے ؎

جہاں قطرے کو ترسایا گیا ہوں
وہیں ڈوبا ہوا پایا گیا ہوں

ڈوبے ہوئے پائے جانے کی اطلاع تو پہنچ گئی مگر قطرے کے لئے ترسنے

کی خبر ہی نہ دی آپنے۔ اپنوں سے یہ تکلف کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ جو واقعات یہاں تک روایت بن کر سیلابی صورت میں پہنچے ہیں ان سے تو معلوم ہوتا ہے کہ واقعی پانی سر سے گزر گیا ہے۔ سچ کہا ہے کسی نے نیکی کر دریا میں ڈال۔ مگر اب تو آپ اس حقیقت کی تہہ کو پہنچ گئے ہوں گے کہ ؎

ڈوبنے کے واسطے کافی ہے اک ہلکی سی موج
ہاں اُبھرنے کے لئے موجوں میں طوفاں چاہیئے

مگر ساتھ ہی ساتھ رشک آتا ہے آپ کی قسمت پر کہ غالب اسی ارمان میں مر گئے کہ ؎

ہوئے مر کے ہم جو رُسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اُٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

آپ کو مقدر نے یہ موقع دیا اور آپنے اس سے فائدہ نہ اُٹھایا۔ اب آپ یہ شکایت بھی نہیں کر سکتے کہ ؎

ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے

حالانکہ ڈوبنے کے واسطے پایابی کا عذر لنگ سمجھ میں نہیں آتا۔ کہنے والے تو یہاں تک کہہ گئے ہیں کہ ؎

کیسا قطرہ، کیسا دریا، کس کا طوفاں، کس کی موج
تو جو چاہے تو ڈبو دے خشکیٔ ساحل مجھے

اور آپ نے قعرِ دریا سے یہ نعرہ بلند کیا کہ ؎

ذرا دیکھئے موت کترا رہی ہے
میں دریا میں ہوں اور طوفاں کنارے

سُنا ہے کہ سبک رانِ ساحل آپ آپ تھے اور آپ اس اطمینان سے تھپیڑے کھا رہے تھے گویا اس بحر میں بھی غزل کہہ سکتے ہیں۔

بات یہ ہے حفیظ صاحب کہ ہم اور آپ تو اس بحرِ جہاں میں دریائی جانور ہیں۔ یہ تو ہمارے قدر شناس ہی فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ہم کو ابھرنا ہے یا ڈوبنا۔ آپکے ہمنام شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

تو جو قہر پہ ہو مائل تو ڈبو دے موجِ ساحل
ترا لطف ہو جو شامل تو بھنور بھی آشیانہ

ہم بہرحال حیوان رہیں گے خواہ بھنور میں رہیں یا آشیانے۔ حیوانِ مطلق ہوں تو بھی نقشِ بر آب اور حیوانِ ناطق ہوں تو بھی زیادہ سے زیادہ آبِ حیات قسم کے تذکروں میں ذکر باقی رہ جاتا ہے خود حباب آب فنا ہو جاتے ہیں۔ گوہرِ مراد کے لئے غوطہ لگانے والے سدِ سکندر نہیں دیکھتے۔

حفیظ صاحب آپ کو خود اپنی پیشگوئی کے مطابق پچھلے سال یہ شوق پورا کرنا چاہیئے تھا۔ یعنی ۱۳۷۰ھ میں، اس لئے کہ آپ کے اس پورے شعر سے تیرہ سو ستر نکلتے ہیں۔

$$\frac{\text{جہاں قطرے کو ترسایا گیا ہوں}}{۱۱۶۸} + \frac{\text{وہیں ڈوبا ہوا پایا گیا ہوں}}{۲۰۲} = ۱۳۷۰$$

خیر اب بھی یہ کمی یوں پوری ہو سکتی ہے ؎

گرا جس وقت پانی میں سخنور کہا خود بادلِ زار اس نے رو کر

د = ۱

$$\frac{\text{جہاں قطرے کو ترسایا گیا ہوں}}{۱۱۶۸} + \frac{\text{وہیں ڈوبا ہوا پایا گیا ہوں}}{۲۰۲} = ۱۳۷۰ + ۱ = ۱۳۷۱$$

آپ کی اس پیشگوئی کے علاوہ میر تقی نے بھی اس واقعہ پر ایک چھینٹا ڈالا ہے

؎ میر صاحب نے کہا غلط سے چشم بددور

و - ب = ۲

جیسے جھکے ہے بڑا گھر ترپائی میں

۱۳۷۳ - ۲ = ۱۳۷۱ھ

تفصیلات کے لئے تشنہ ہوں امید ہے کہ آپ سیراب فرمائیں گے۔

شوکت تھانوی

حفیظ ہوشیارپوری کے نام

گڑھی شاہو - لاہور

۱۷ فروری ۱۹۵۱ء

حفیظ مکرّم

گردشِ لیل و نہار کو آپ خدا جانے کیا سمجھتے ہوں گے مگر میرا اعتقاد یہ ہے کہ زندگی نہایت انصاف کے ساتھ دو حصّوں میں تقسیم کر دی گئی ہے ۔ زندگی کے دن اور زندگی کی راتیں ۔ دن کی حیثیت میرے نزدیک دفتری اور سرکاری ہے ۔ خواہ وہ دفتر کسی قسم کا دفتر ہو اور سرکار کوئی بھی سرکار ہو ۔ ذمہ داری خواہ کسی قسم کی ہو معقول سے معقول آدمی کو اہلکار بنا دیتی ہے ۔ لُون تیل لکڑی کی فکر یا بچّوں کی ذمّہ داری بچّوں کی ماں کو سرکار بنائے بغیر نہیں رہتی اور اگر انسان کسی اور سرکار کا بے روزگاری یا خوش قسمتی

سے غلام نہیں ہے تو بھی اس گھر یلو سرکار سے مفر نا ممکن ہے۔ زندگی کے دن تو دفتری ماحول میں حکام کی خوشامد اور ماتحتوں کی دلدہی میں پھر گھر پہ بیوی سے ڈانٹ کھا کر بچوں کو ڈانٹنے میں، یا بچوں کا دلار کرکے بیوی کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش میں گزرتے رہے ہیں اور گذرا کریں گے۔ البتہ راتیں اپنی ہیں اور یہی زندگی کا نجی حصّہ ہے جس کو میں نذرِ خواب نہیں کرتا۔ دن بھر رات کے آنے کی دعائیں مانگتا ہوں اور جب رات کو سب سو جاتے ہیں تو میری انجمن بیدار ہوتی ہے۔ میری شریکِ صحبت اس وقت میری کتابیں ہوتی ہیں اور اگر کوئی نئی کتاب میسّر نہ ہو تو میرا قلم حقِ رفاقت ادا کرتا ہے۔

آج رات جس کتاب سے میں نے باتیں کیں وہ ایک رسالے کا سالنامہ ہے جسے کھولتے ہی آپ کی غزل اس طرح سامنے آگئی جیسے آپ خود آگئے ہوں میں نے یہ غزل اس طرح پڑھی جیسے خود آپ ہی سے سُن رہا ہوں۔ مگر اس ملاقات میں ایک عجیب تشنگی کی کیفیت میں نے محسوس کی۔ بات یہ ہے کہ آپ کا کلام پڑھ کر اگر کوئی آپ سے ملنا چاہے تو اُسے سخت مایوسی ہوتی ہے آپ کے بجائے آپ کے محبوب سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ وہ اصغر والی کیفیت آپ کے یہاں نہیں ہے۔ ؎

اصغر سے ملے لیکن اصغر کو نہیں دیکھا
اشعار میں سنتے ہیں کچھ کچھ وہ نمایاں ہے

بلکہ آپ کا کلام پڑھ کر تو جی چاہتا ہے کہ خود آپ ہی کا شعر آپ کو سنایا جائے کہ ؎

ہم نے اوروں سے سنا ہے جو ترا حال حفیظؔ
تیرے اندازِ سخن سے وہ نمایاں تو نہیں

آپ کے کلام سے اس کے جو محبوب نمایاں ہوئے ہیں وہ میرے لئے بوجوہ بیکار ہیں سب مجھے تو اس وقت آپ کی یہ غزل پڑھ کر خود آپ ہی سے غزل کے موضوع پر گفتگو کرنا ہے اور اس گفتگو کا طریقہ میرے امکان میں صرف یہ ہے کہ قلم لے کر بیٹھ جاؤں اور آپ کو مخاطب سمجھ لوں۔

حفیظ صاحب آپ ہی بتائیے کہ غزل کے موضوع پر آپ سے بات نہ کی جائے تو کس کو مخاطب کیا جائے۔ یہاں تو سب ہی وہ نظر آتے جن کے لئے ؎

بہ قدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل

اور اپنے بیان کے لئے وسعتوں کی تلاش میں وہ وہاں پہنچ گئے ہیں جہاں سے ان کو بھی ؎۔

کچھ خود اپنی خبر نہیں آتی

غنیمت ہے کہ اس دَور میں آپ غزل کو آبِ حیات پلا رہے ہیں اور صرف غزل ہی کو زندہ رکھنے میں کوشاں نہیں ہیں بلکہ غزل کو خود اپنی زندگی کا آئینہ دار بھی بنائے ہوئے ہیں۔ آپ غزل کے دَور کی طرف واپس نہیں گئے ہیں بلکہ

غزل کو اس دور کا شریکِ سفر بنائے ہوئے ہیں اور ظرف تنگنائے غزل ہی میں وہ وسعتیں پیدا کر دی ہیں کہ ہر بیان کی گنجائش اُس میں نظر آتی ہے۔

آپ کے کچھ شعر حافظہ کی سطح پہ اُبھر رہے ہیں مگر ذرا ٹھہر جایئے میں ایک تازہ گلوری قوام سے معطر کر کے کھا لوں تاکہ رنگ چوکھا آئے اور میں اپنی اس حیرت کا اظہار بھی کر سکوں کہ خدا جانے آپ بغیر پان کھائے ایسے رنگین شعر کیونکر کہہ لیتے ہیں۔ سگریٹ پی کر شعر کہنا میرے نزدیک ایسا ہی ہے جیسے کوئی ٹائپ کر کے نامۂ محبت کسی کو بھیجے۔ شیو کرتے وقت آئینہ میں اپنا عکس دیکھنے کا اتفاق تو آپ کو ہوا ہوگا مگر آپ نے کبھی اس بات پر بھی غور کیا ہے کہ آپ صورت سے اتنے بڑے شاعر نظر نہیں آتے جتنے بڑے دراصل آپ ہیں۔ اگر بمشکل تمام آپ کو صورت دیکھ کر شاعر تسلیم بھی کر لیا جائے تو آپ زیادہ سے زیادہ بلینک ورس کے شاعر نظر آتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ امیر مینائی بن جایئے۔ یا غالبؔ کی طرح کلاہ پاپاخ پہنئے یا داغؔ کی طرح دستار سے شوق فرمایئے ایک مرتبہ صرف پان کھا کر دیکھئے کہ آپ کے لبوں پر کیسی غزل برستی ہے ـــــ فی الحال تو آپ ہی کا شعر آپ پر صادق آتا ہے کہ ؎

کوئی اس شخص کی محرومیٔ قسمت دیکھے
تم سے مل کر بھی رہی ہو جسے انساں کی تلاش

آپ کے انسان ہونے میں شک نہیں۔ اور بیشک آپ شاعر بھی ہیں۔ مگر پان

کہا کہ آپ اشرف المخلوقات بن سکتے ہیں اور شاعر نظر بھی آ سکتے ہیں۔

خدا بھلا کرے اقبال صفی پوری کا قوام خانہ ساز کی ایک چھوٹی سی شیشی دے گئے ہیں جس نے اس وقت روح کو ایسا مہکایا ہے کہ گویا خیام اور حافظ سے معانقہ کر رہا ہوں۔ منہ میں پان ہے۔ لبوں پر اس کی سُرخی ہے۔ روح میں تعطر ہے اور ایک ہلکا سا سرور اس سرور کو دو آتشہ بنانے کے لئے اسی خوشبودار منہ سے آپ کا یہ شعر گنگنا رہا ہوں۔ ؎

کوئی دیکھے ہمارے احترامِ عہدِ رفتہ کو
وفا پہ اب بھی قائم ہیں محبت چھوڑ دی ہم نے

حفیظ صاحب بدمذاقی نہ سمجھئے گا بلکہ اس کو اپنے اس شعر کا معجزہ یا اپنے اس شعر کو خود اپنا معجزہ سمجھئے گا۔ اس شعر کی تمام بلند کیفیات تو مجھ پر طاری ہیں مگر ایک تفسیر بھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ پڑوس میں ایک میر صاحب رہتے ہیں۔ بلکہ وہ کیا رہتے ہیں ان کی بیوی رہتی ہیں جن کو مدت ہوئی میر صاحب طلاق دے چکے ہیں البتہ صبح شام آجایا کرتے ہیں کہ بیگم کچھ سودا سلف منگانا ہو تو میں حاضر ہوں اور یہ سلسلہ برسوں سے چل رہا ہے۔ یہ احترامِ عہدِ رفتہ نہیں تو اور کیا ہے۔ محبت بلکہ نکاح تک ختم ہونے کے بعد وفا پر قائم رہنے کی جیتی جاگتی مثال ہے یا نہیں۔

خیر یہ تو ایک اتفاقی لطیفہ تھا جو پڑوس ہی میں مل گیا مگر یہ شعر غزل کے

منکروں کے سامنے پیش کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ترقی پسندی اگر دھاندلی کا دوسرا نام نہیں ہے تو ان منکروں کو غزل پر ایمان لے آنا چاہیئے۔ نہ گل ہے نہ بلبل ہے۔ نہ ہجر کا رونا ہے نہ فراق کا دکھڑا۔ ایک زندہ حقیقت ہے اور غزل کے ایک شعر میں۔ شعر بھی خالص غزل کا ہے اور انداز بیان بھی زلف و رخسار کے زمانے کی غزل کا نہیں بلکہ آج کا۔ لیجیئے ایک شعر اور یاد آیا ؎

غم زندگانی کے سب سلسلے
بالآخر غم عشق سے جا ملے

حفیظ صاحب اگر سچ پوچھیئے تو غم عشق کا حق اس شعر نے ادا کیا ہے اس سمندر کی بیکرانی کا تقاضہ تو یہی تھا کہ غم زندگانی کے سب سلسلے موج در موج اسی سے جا کر مل جائیں مگر یہ شعر اب تک کہاں تھا۔ اس نسل کا ایک شعر اب تباہ کیئے ہوئے تھا اور غالباً آپ کا یہ شعر اسی شعر میں چھپا ہوا تھا۔ ؎

آلام روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم ملا اُسے غم جاناں بنا دیا

مگر یہ شاعر کی صناعی تھی اور آپ نے اس صناعی کو کلیہ بنا دیا ہے۔ لائیے اس شعر کے اعزاز میں ایک تازہ گلوری اور کھاؤں اور تھوڑا سا قوام بھی اس گلوری کا ساتھ دے تو لطف آجائے۔ یہ بزم مہک اٹھے۔ آج میرے ملازم نے پاندان کا غسل صحت منایا ہے ہر چیز سلیقے سے رکھی ہوئی ہے تو (؟) کی

طرح آبدار چونا۔ دودھیا کتھا۔ باریک چھالیا۔ موٹی موٹی الائچیاں۔ ایک ڈبیا میں
دانے دار تمباکو دوسری میں زعفرانی پتی۔ قوام میں نے چاندی کی ڈبیا میں الگ
رکھا ہے اس لئے کہ اسی قسم کی دوسری ڈبیا میں قوام کی نقرئی گولیاں ہیں۔
آج پاندان جگمگا رہا ہے۔ پانوں کی صافی بھی نئی ہے۔ سُرخ ڈول میں لپٹے ہوئے
پستئی پان نئی نویلی دلہن نظر آتے ہیں جو ابھی کشمیر سے بیاہ کر آئی ہو۔ ایک
چھوٹی سی قینچی بھی رکھی ہے جس سے پان کی زبان یا پان کا گلا ہوا حصہ تراشا
جاتا ہے اور یہ شفاف سی چمچی جس پر کسی جراح کے نشتر کا گماں ہوتا ہے۔
قوام کو زبان تک پہنچانے اور نفاست سے پہنچانے کا آلہ ہے ــــــــ
حفیظ صاحب غور تو کیجئے کہ آپ ایک دیا سلائی کی ڈبیا اور ایک سگریٹ کی
ڈبیا پر قناعت کر کے کیسی کیسی نعمتوں سے محروم ہو گئے ہیں۔ ؎

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے

پان نہ کھانے کے جرم میں آپ کی سزا تو صرف یہ ہونا چاہیئے کہ وہ بد اعمال
شعر جو آپ پر نازل ہو جاتے ہیں ایک دم روک دیئے جائیں۔ مگر یہ بھی خدا
کی دین ہے کہ پان سے آپ محروم اور شعر ایسے ایسے کہتے ہیں ؎

کسے معلوم تھا ترکِ محبت
کوئی پیشِ نظر ہر دم رہے گا

ایک شعر اور سنیئے :۔

دیکھنے والے مجھے پیکرِ غم کہتے ہیں
یوں بھی منسوب تری ذات ہوئی ہے مجھ سے

ایک طرف تو آپ کو دیکھتا ہوں آپ کے ان اشعار کو دیکھتا ہوں پھر آپ کے اس ذوق کو دیکھتا ہوں جس نے آپ کو ایک مشتاق تاریخ گو بنا رکھا ہے۔ دن رات آپ کو یہی فکر رہتی ہے کہ یہ شخص جو ابھی مل کر گیا ہے اگر آج ہی مر جائے تو اس کی تاریخ یہ ہو سکتی ہے بلکہ آپ کو رنج ہوتا ہے کہ فلاں صاحب خواہ مخواہ زندہ رہنے پر مصر ہیں جبکہ نہایت لاجواب مادّۂ تاریخ بیکار ہوا جا رہا ہے۔ آپ سے کوئی بات کرے اور آپ فرمائیں کہ آپ کی اس گفتگو کے فلاں جملے سے اس ملاقات کی تاریخ نکل آئی ہے۔ ڈر معلوم ہوتا ہے کہ کب آپ کوئی برجستہ تاریخ نکال کر مرنے پر مجبور کر دیں یقین جانیے میں ایسا کور ذوق نہیں کہ آپ تاریخ وفات نکالیں اور میں زندہ رہوں۔ البتہ التماس یہ ہے کہ بچّے بہت چھوٹے ہیں اور کچھ ان سے بھی زیادہ چھوٹے بچّے دُنیا کی آبادی میں اضافہ کرنے کے امید وار ہیں لہٰذا اگر تاریخ وفات میں ذرا تاخیر سے کام لیں تو اچھا ہے۔ تاریخ گوئی کے اس شوق کو فی الحال تاریخ پیدائش اور تاریخی ناموں سے پورا کریں تو مناسب ہوگا۔ ویسے جو آپ کی مرضی ہو۔

بیچارے حفیظ صاحب۔ منہ میں دبی ہوئی گلوری اگالدان کی طرف جارہی ہے اور میں پھر پاندان کی طرف بڑھنے کے لئے یہ خط ختم کرتا ہوں۔

شوکت تھانوی

عابد علی عابد کے نام

لاہور

۱۹ر فروری ۱۹۵۱ء

سیّدی،

کاش آپ پان کھاتے ہوتے اور اِس وقت میں اپنی بزم اس طرح آراستہ کرتا کہ اِدھر میں ہوتا اُدھر آپ اور بیچ میں پاندان کھلا ہُوا ہوتا اور یہ شعر مصوّر نظر آتا ؎

ناز کے قابل یہ دَور اے ساقیٔ میخانہ ہے
اُس طرف تُو اِس طرف میں بیچ میں پیمانہ ہے

مگر آپ سے پان کے متعلق گفتگو کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی رستمِ زماں گاما پہلوان سے میر کے کسی تہتر ڈوبے نشتر کے متعلق بات کرے اور گاما کو یہ افسوس ہو کہ اتنے

بڑے شاعر کو کبھی ورزش سے شوق نہ رہا اور پھر بھی لوگ اُن کو اُستاد امام بخش ناسخ سے بڑا شاعر مانتے ہیں حالانکہ اُستاد ناسخ بڑے ورزشی شاعر تھے اور اللہ نے خوراک کے لئے معدہ بھی ویسا ہی عطا کیا تھا۔

سید صاحب میں ہر ایک سے پان نہ کھانے کا شکوہ نہیں کرتا بلکہ سچ پوچھئے تو بہت سے پان کھانے والے ایسے ہیں کہ ان کے لئے دست بدعا رہتا ہوں کہ اللہ تعالےٰ ان کو پان سے اور پان کو ان سے محفوظ رکھے۔ مگر آپ سے یہ شکایت اس لئے ہے کہ آپ اپنے ڈھب کے آدمی ہیں۔ خوش مذاق ہونا معمولی بات نہیں مگر یہ غیر معمولی بات ضرور ہے کہ آپ ایسا خوش مذاق آدمی پان سے اس قدر بیگانہ ہے۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ کوئی نہ کوئی کمی مکمل سے مکمل آدمی اپنے کو فرشتہ بنانے سے محفوظ رکھنے کے لئے دانستہ اپنے میں رہنے دیتا ہے۔

خیر چھوڑیئے اس پان کے ذکر کو۔ میں اگر آپ کی خاطر سگریٹ آشنا نہ ہو سکا تو آپ سے پان ناشناسی کی شکایت بھی جائز نہیں۔ آپ بغیر پان کھائے بھی اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ پان کھا لیتے تو خدا جانے کتنے اچھے معلوم ہوتے۔ آپ سے مل کر میں نے بظاہر واجبی سی باتیں کی ہوں گی مگر یہ تو ضروری نہیں ہوتا کہ کسی سے مل کر بات ہی کی جائے تو ملاقات کا مفہوم پورا ہوتا ہے۔ عزیز دوستوں سے اُسی طرح ملتا ہوں جس طرح اپنی

پسندیدہ کتابیں پڑھتا ہوں۔ دوست سے مل کر خواہ مخواہ کی باتیں کرنا میرے نزدیک ایسا ہی ہے جیسے کوئی بد مذاق بہ آوازِ بلند مطالعہ کرے۔ لوگ ملاقات کا صحیح وقت اُس کو سمجھتے ہیں جب ایک دوست اپنے گھر سے اُٹھ کر دوسرے دوست کے یہاں جاتا ہے اپنا اور اس کا دونوں کا وقت برباد کرتا ہے اور پھر گفتگو کتنی اہم ہوتی ہے:۔

"بہت دن سے ملے ہی نہیں۔ میں نے کہا لاؤ آج مل ہی لیں۔"

"موسم دیکھ رہے ہو کس قدر نامعقول ہے۔"

"بھئی میرا ارادہ تو یہ ہے کہ مری چلا جاؤں۔"

"وادیٔ کاغان بھی خوب جگہ ہے۔"

"مگر مری ——"

"ہاں مری تو پھر مری ہے۔ مگر وادیٔ کاغان بھی وادیٔ کاغان ہے۔"

"تو بھئی کبھی کبھی مل کرو۔"

"اچھا تو پھر خدا حافظ۔"

ثابت یہ ہوا کہ ان دونوں دوستوں میں سے کسی کو نہ موت پوچھتی ہے نہ زندگی کو ان کی ضرورت ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ میرے اور آپ کے درمیان کبھی اس قسم کی کوئی ملاقات نہیں ہوئی۔ ایک مرتبہ کسی کی سفارش کرنے گیا تھا۔ اور اس سفارش کے بعد مدتوں نادم رہا۔ بے حیائی ملاحظہ ہو کہ دوسری

مرتبہ بھی اسی مہم پر روانہ ہوا تھا مگر شکر ہے کہ آپ نہ ملے۔ ایک آدھ مرتبہ اور کسی کام سے ملا ہوں گا اور نہایت مختصر سی گفتگو ہوئی ہو گی۔ دعوتوں۔ مشاعروں اور جلسوں کی ملاقاتیں تو ایسی ہوتی ہیں کہ سب ہی اپنی اپنی مصیبت میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ایسی ملاقات تو سُنا ہے کہ حشر کے دن بھی ہو گی مگر میں ان میں سے کسی ملاقات کا قائل نہیں۔ میں تو اُن ملاقاتوں کا قائل ہوں جب آپ رات کے سناٹے میں میری بزمِ تصوّر میں کبھی کبھی آ نکلتے ہیں۔ جس طرح آج تشریف لے آئے ہیں۔ میں نے بڑی گرمجوشی سے آپ کا استقبال کیا ہے۔ سب سے پہلے آپ سے کہا ہے کہ خدا کیلئے عابد صاحب یہ پائپ اپنی جیب میں رکھ لیجئے معلوم ہوتا ہے کہ یا تو ابھی آپ بانسری سُنانا شروع کر دیں گے یا مُنہ سے ہاکی کھیلنے لگیں گے پان نہیں کھاتے نہ کھائیے مگر دانتوں سے مگدر بھی نہ ہلائیے۔

شکر ہے کہ آپ نے اپنے مخصوص انداز میں مسکرا کر پائپ کو جیب میں رکھ لیا اور میں نے آپ سے فرمائش کی کہ آج کی رات مجھے اپنی "آج کی رات" سُنا دیجئے۔ ؎

دل ہے آئینۂ حیرت سے دو چار آج کی رات
غمِ دوراں میں ہے عکسِ غمِ یار آج کی رات

اور جب آپ اس شعر پر پہنچے ؎

بوئے خوں آتی ہے صحرائے تمنّا سے مجھے
کھیلتا ہوں دلِ وحشی کا شکار آج کی رات

تو مجھے یک بیک موضوعِ گفتگو سوجھ گیا۔ سوجھ کیا خاک گیا بلکہ یہ کہیے کہ اس موضوع پر کئی مرتبہ آپ سے باتیں کرنے کو جی چاہا مگر موقع آج ملا ہے۔ عابد صاحب آپ صرف عالم نہیں معلّم بھی ہیں۔ کیا آپ نے کبھی اس بات پر غور کیا ہے کہ ہمارے اسکولوں اور کالجوں سے فارغ التحصیل ہو کر جو بے شمار نوجوان ہر سال نکلتے ہیں ان سے ہم اپنے شعر اور اپنے ادب کے مستقبل کے متعلق کیا اُمیدیں وابستہ کر سکتے ہیں۔ میں تو بہت سی نااُمیدیاں وابستہ کئے بیٹھا ہوں مگر ـــــ اس باب میں آپ کی رائے قطعی سمجھی جا سکتی ہے کہ آپ کا تو اوڑھنا بچھونا یہی ماحول ہے۔ اس دَور کے تعلیم یافتہ نوجوانوں سے بات کرتے جی ڈرتا ہے کہ خدا جانے یہ ہونہار کس بات کا کیا جواب دے کر کتنا صدمہ پہنچا دیں۔ آپ کو شاید یقین نہ آئے مگر یہ لطیفہ نہیں واقعہ ہے کہ ایک گریجویٹ قسم کے بحرالعلوم سے حال ہی میں ملنے کا اتفاق ہوا اِدھر اُدھر کی دو چار ادبی باتوں کے بعد اُن محترم نے یہ سوال کر کے آئینہ حیرت بنا دیا کہ " دیوانِ غالب میں کچھ غزلیں اسدؔ کی بھی ہیں کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ان کا دیوان علیحدہ چھاپ دیا جائے"؟ ظاہر ہے کہ اس سوال پر پہلا گمان خوش طبعی کا ہو سکتا ہے مگر جب یہ معلوم ہوا کہ وہ حضرت مزاح نہیں فرما رہے بلکہ واقعی

دیوانِ غالب میں کلامِ اسد دیکھنے کے روادار نہیں تو اُن سے پوچھنا پڑا کہ جناب کس یونیورسٹی کے گریجویٹ ہیں تاکہ اپنے بچوں کو اس یونیورسٹی سے بچانے کی کوشش کی جائے۔ اسی قسم کے ایک اور برخوردار ایک مرتبہ سخت پریشان تشریف لائے کہ قبلہ ایک مقطع ہے ؎

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

سوال یہ ہے کہ یہ غالب کا مقطع ہے یا آتش کا۔ میں نے اپنے بعض دوستوں سے شرط باندھی ہے کہ یہ غالب کا مقطع ہے اور اس میں آتش کے معنی صرف آگ کے ہیں مگر میرے دوست کہتے ہیں کہ آتش خواہ تخلص ہو مگر اس کے معنی آگ ہی کے رہتے ہیں اور یہ آتش کا مقطع ہے۔ میرا جی چاہا کہ ان عزیز کے والدین کو ایک تعزیت نامہ لکھ بھیجوں۔ مگر عابد صاحب تعلیم کے نتیجہ کے طور پر یہ جہالت تو اب اس قدر عام ہے کہ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ کے اشعار اب کتنے دنوں تک اور سمجھے جا سکیں گے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ کسی دن آپ ہی کے سامنے آج کے طالب علموں سے آپ کے اس شعر کا مفہوم پوچھوں کہ ؎

بوئے خوں آتی ہے صحرائے تمنا سے مجھے
کھیلتا ہوں دل وحشی کا شکار آج کی رات

ممکن ہے آج کے طالب علموں میں سے کچھ ایسے نکل آئیں جو مجھے شرمندہ کر دیں مگر یہ میرا عقیدہ ہے کہ بہت جلد وہ دور آ رہا ہے جب آپ کے اسی شعر کا مفہوم کچھ اس قسم کا بیان کیا جائے گا کہ صحرائے تمنا ایک جنگل تھا جس میں رات کے وقت دلِ وحشی کا شکار ایک زمانے میں کھیلا جاتا تھا مگر تھل ڈویلپمنٹ اتھارٹی نے اب وہاں متعدد شہر آباد کر دیئے ہیں نہریں نکال دی ہیں اور دل بلکہ ہر قسم کے وحشی جانوروں سے یہ علاقہ پاک کر دیا گیا ہے لہٰذا اب یہ شکار نہیں ہوتا۔ صاحب جو لوگ غالبؔ اور اسدؔ کو آج دو مختلف افراد سمجھ رہے ہیں ان کی اولاد آپ کے اس شعر کا یہ نہیں تو کیا کوئی اور مفہوم بتا سکے گی۔ آپ اس وقت تو یہ کہہ رہے ہیں کہ ؎

دوستو ہم نفسو سنتے ہو عابدؔ کی غزل
یہ وہی شعلہ نوا سوختہ جاں ہے کہ جو تھا

مگر سوال تو یہ ہے کہ اس شعلہ نوا سوختہ جاں کا مستقبل کیا ہے "ہے کہ جو تھا" تک تو غنیمت ہے مگر دونگٹے تو کھڑے ہوتے ہیں اُس وقت کے تصور سے جو اب آ رہا ہے۔ کوئی تعجب نہیں کہ اِس آنے والے دور میں کوئی ... ایسا پیدا ہو جائے جس کو اردو شعر و ادب سے دلچسپی ہو اور جو آپ کا یہ شعر لئے ہوئے کسی اردو دان کی تلاش میں جنگل جنگل مارا مارا پھرے ؎

مغ بچے خوش ہیں کہ بزم ان کی ہے ساقی ان کا
بر سرِ کار وہی پیرِ مغاں ہے کہ جو تھا

اور اگر اُس کو اتفاق سے کسی جگہ کوئی اُردو داں مل جائے تو اُس سے صرف اتنا پوچھ لے کہ "مُرغ بچے" کس جانور کے بچّے کو کہتے ہیں اور پیرِ مغاں کا مزار کس علاقے میں ہے۔

آپ نے غزل کے اس شعر میں اس دور کی جو تاریخ لکھی ہے وہ تو درست ہے مگر تاریخ میں خود آپ کے اس شعر کے لئے کتنی گنجائش ہے اور کس قسم کی گنجائش ہے اس پر بھی تو غور کیجئے۔ سوال تو یہ ہے کہ اس کا علاج کیا ہے۔ ہماری موجودہ تعلیم سے جہل کی جو اشاعت ہو رہی ہے اُس سیلاب کو روکنے کا بھی کوئی طریقہ آپ کے ذہن میں ہے۔ عابد صاحب میں خالص جاہلوں سے کبھی مایوس نہیں ہوا وہ بڑے کار آمد ہوتے ہیں مگر نہایت خوفناک ہوتے ہیں یہ پڑھے لکھے جاہل جو ہمارے آپ کے جانشین بننے والے ہیں۔ جہاں تک موجودہ تعلیم کا تنخواہ۔ پنشن اور پراویڈنٹ فنڈ سے تعلق ہے وہ ٹھیک ہے مگر علم ؟ اس کا بس خدا علیم ہے۔

یہ بات آپ سے نہ کرتا تو کس سے کرتا اور ان باتوں پر آپ غور نہ کریں گے تو کون کرے گا۔ اچھا آپ غور کیجئے اور مجھے غور کرنے دیجئے کہ آپ بغیر پان کھائے اس قدر معقول آدمی۔ ایسے خوش فکر شاعر اور ایسے زندہ دِل دوست کیوں کر بن گئے ہیں۔ بہر حال میں تو پان کھاتا ہوں۔ رات بھیگ رہی ہے۔ بستر کی کشش بڑھتی جا رہی ہے۔ ایک تازہ گلوری کھا کر

پہلے لیٹوں گا پھر اُس کو آگال دان کے سپرد کر کے اپنے کو نیند کے سپرد
کر دوں گا۔ خدا حافظ۔

شوکت تھانوی

حضرت جگر مراد آبادی کے نام

گڑھی شاہو۔ لاہور
۱۵۔ جون ۵۴ء

صدیق مکرم

ابھی مری میں آپکے ساتھ دو بیدار راتیں اور ڈیڑھ خواب آلود دن گذار کر لاہور پہنچا ہوں مگر تشنگی باقی ہے اور پھر آپ ہی سے مخاطب ہوں۔ مری میں تو رمی کا شغل جاری رہا اور اس کثرت سے جاری رہا کہ رمی پر مری کا اور مری پر رمی کا گمان گذرتا ہے۔ اگر آپ باور کریں تو عرض کردوں کہ واپسی میں مری کے فراز سے پنڈی کے نشیب تک ہر فرد پر تاش کے پتّوں کا شبہ ہوتا تھا۔ ہر عورت جو نظر سے گذری پھول کی بیگم یا اینٹ کی ملکہ نظر آئی۔ ہر مرد پر پان کے غلام یا حکم کے بادشاہ کا گمان گذرا۔ غضب

خدا کا دو مسلسل راتیں تاش کی گڈیاں پھینٹ پھینٹ کر بسر کر دیں۔ زندگی میں ایسی ایسی خدا جانے کتنی راتیں بسر کی ہیں اور ایک سے ایک کھلاڑی سے واسطہ پڑا ہے مگر آپ کے انہماک کا جواب نہیں۔ اس موقع پر آپ ہی کا ایک شعر آپ کو سناتا ہوں جو آپ کے لئے آپ کی ایک مقبول دعا کی حیثیت رکھتا ہے۔ ؎

عشق بے قیدِ تصور شوق بے قیدِ نظر
مجھ کو جو کچھ چاہیئے بے حد و پایاں چاہیئے

بے شک جو شغل بھی اختیار کیا انتہا پر پہنچ کر اور انتہا تک پہنچا کر اختیار کیا۔ رندی اور سرمستی کا وہ زمانہ جب ہر نظر جام و سبو اور ہر نفس میخانہ تھا ابھی کل کی بات ہے۔ زمانۂ بلا نوش پڑھا ضرور تھا مگر ۱۹۲۶ء کی ایک رات بمبئی کے ایک مشاعرے میں دیکھ بھی لیا جب ایک اُجاڑ سی صورت کا شاعر جیسے لیتھو پر چھپی ہوئی خیام کی تصویر مشاعرے کے ایک گوشے سے اُٹھا اور اس نے مقطع نما مطلع جھوم کر پڑھا ؎

نظر کو مستِ مئے حسن کر حجاب اُٹھا
جگرؔ شراب نہ پی تہمتِ شراب اُٹھا

اور میں چونک پڑا کہ کیا یہی ہیں جگرؔ اور فوراً ہی جب جگرؔ نے یہ شعر پڑھ کر تصدیق کر دی۔ ؎

کدھر سے برق چمکتی ہے دیکھیں اے واعظ
میں اپنا ساغر اٹھاتا ہوں تو کتاب اٹھا

۱۹۲۶ء کی وہ رات اور آج کا دن۔ تعلقات کے اٹھائیس سال۔ اور ہم دونوں ایسے سخت جان کہ دونوں کو تعلقات کی یہ مدت نہ مار سکی۔ اس عمر کے نہ دوست ملتے ہیں نہ دشمن۔ اس مدت میں دوستیاں دشمنی بن جاتی ہیں اور اتنی طویل دشمنی بھی وفا نہیں کرتی۔ آنے کو تو بہت سے انقلاب آئے۔ ایک رند نے توبہ کی۔ ایک خانہ بدوش صاحب خانہ بنا۔ جس کا کوئی نہ تھا وہ کسی کا ہو گیا اس کے علاوہ اور بھی بہت سی گتھیاں سلجھیں۔ بڑے بڑے سلجھاؤ الجھے۔ ملکوں کی تقسیم ہوئی۔ نئے نئے ممالک کرۂ ارض پر ابھرے اور بڑا لے ایسے ایسے ہوئے کہ آخر ہم بھی بٹ گئے آپ ادھر۔ میں ادھر اور بیچ میں آگ اور خون کے مواج سمندر۔ مگر یہ تعلقات قائم رہے رندی کی توبہ ان کو ختم نہ کر سکی۔ خانہ بدوش کی خانہ آبادی ان پر اثر انداز نہ ہوئی نہ کسی الجھن نے ان کو سلجھایا نہ کسی سلجھاؤ نے ان کو الجھایا۔ درمیانی آگ اور خون کے سمندر دیکھ دیکھ کر بھی یہ تعلقات یہی کہتے رہے کہ۔ ؎

اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

اور یہ تعلقات صرف مجھ ہی سے نہیں ہیں۔ آپ کہتے ضرور ہیں کہ آپ کو مجھ سے ایک خصوصیت ہے مگر آپ کی یہ خصوصیت اتنی عام ہے کہ ؎

اللہ ری چشمِ یار کی معجز بیانیاں
ہر اک کو ہے گماں کہ مخاطب ہمیں رہے

میں نے تو آپ کی اس خصوصیت کا مرکز ان کو بھی دیکھا ہے۔ جن سے گلے ملنے کے بعد جن کو نہایت خلوص سے پہلو میں جگہ دینے کے بعد آپ یہ بھی کہتے ہیں کہ۔ "آپ مجھ سے یہ تقاضا نہ کیجئے گا کہ میں آپ کو آپ کا نام بھی بتاؤں نام اصل چیز نہیں ہے شخصیت اصل شے ہے۔ دماغ میں نام محفوظ نہیں تو نہ ہو مگر وہ جو ایک تعلق ہوتا ہے روح کا روح سے۔ جی ہاں۔ وہ بہرحال موجود ہے۔ فاصلہ اور وقت نام دماغ کو محو کر سکتا ہے مگر اس تعلق کو ختم نہیں کر سکتا"
بلکہ میں نے آپ کی اس خصوصیت کا مرکز اُن ناجنسوں کو بھی دیکھا ہے جو محض ایک جذبہ پرستاری لے کر اُس وقت آجاتے ہیں جب آپ تاش کھیل رہے ہوں مارے اخلاق کے آپ تمام حرف و حکایت اور تمام دیدہ و دل بن جانا چاہتے ہیں مگر اس اہتمام کے باوجود شرح عاشقی اس لئے نہیں ہو سکتی کہ توجّہ ہوتی ہے آپ کی تاش کے پتوں کی طرف اور دل دہی کرنا چاہتے ہیں آپ مہمان کی بھی آپ کی وہ کیفیت بھی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے کہ ہاتھ میں رمی کے بادشاہ ہیں جن کو آپ گھبرا گھبرا کر مرتّب کر رہے ہیں اور باتیں اُن حضرت سے بھی کرتے جاتے ہیں۔
وہ خلوص کا سولئے خلوص کے کوئی نام نہیں ہوتا اہل خلوص کا تعارف ایک

مخلص مل خود ہی کرا دیتا ہے " اور وہ حضرت اپنی ہانک رہے ہیں " صاحب ہم تو ادھر آکر مسلسل پریشانیوں میں مبتلا ہوں "

آپ اپنے تیرہ پتوں میں گم ان کی بات کا جواب بھی دیتے جاتے ہیں اور اپنے کھیل کے ساتھیوں سے بھی مخاطب رہتے ہیں نتیجہ یہ کہ مکالمہ کچھ اس طرح کا بن جاتا ہے۔

" جی ہاں وہ پریشانیاں تو ہوتی ہی ہیں۔ صاحب گن لیجئے تیرہ پتے ہیں نا "

" کوئی مکان الاٹ نہیں ہوا۔ ملازمت بھی اب تک نہیں مل سکی "

" جی ہاں۔ یہ امتحانی دور تو گذرتے ہی ہیں۔ آپ کی چال ہے صاحب "

" بچوں کی تعلیم کا بھی کوئی بندوبست نہیں "

" جی ہاں۔ آپ ادھر کھسک کر بیٹھئے پتے دکھائی دیتے ہیں "

" پچھلے مہینے والد صاحب کا بھی انتقال ہو گیا "

" جی ہاں وہ تو ہو ہی جاتا ہے "

اور پھر ایک دم چونک کر " جی کیا فرمایا۔ والد صاحب کا انتقال "

اس کے بعد آپ تاش کے پتے رکھ کر واقعی تعزیت کرنا چاہتے ہیں بلکہ ایک آدھ تعزیتی جملہ بھی کہتے ہیں جس سے اس آدمی کو اپنے باپ کے مرنے پر شرمندہ ہو جانا چاہیئے۔ مگر چونکہ وہ صرف یتیم نہیں بلکہ ظہیم العقل بھی ہوتا ہے لہذا آپ فاتحہ کے لئے ہاتھ اٹھاتے ہیں اور چونکہ ہاتھ میں تاش

بھی ہوتے ہیں لہذا آپ گڈی سے پتا گھسیٹتے ہوئے کہتے ہیں ۔

"آپ کے والد مرحوم ـــــ جوکر"

اور آپ کو جوکر مل جانے پر، بجائے اُن حضرت کے آپ کے کھیل کے ساتھی یتیم بن کر رہ جاتے ہیں اور آپ "شو" کر کے بازی جیت لیتے ہیں

خیر یہ تو ایک تمثیلی منظر خواہ مخواہ بیچ میں آگیا ورنہ میں عرض یہ کر رہا تھا کہ آپ کی اس خصوصیت کی یہ عمومیت مجھ کو اس لئے ناگوار نہیں ہے کہ مجھے آپ سے نہیں خود اپنے سے غرض ہے اور مجھے جو خصوصیت ہے وہ خصوصیت کے جواب میں خصوصیت بھی نہیں چاہتی اس لئے کہ خصوصیت نہ کوئی تجارتی لین دین ہے نہ جوابی پوسٹ کارڈ۔ آپ کے پاس بیٹھ کر میں صرف اس شعر کی تفسیر بن جاتا ہوں ؎

تیری محفل میں ہے اک ننگ محبت بھی ترا
دیکھنا ہو کے پشیمان نہ جانے پائے

اور یہی غنیمت ہے کہ میں اس محفل سے کبھی پشیماں ہو کے نہیں اُٹھا۔ ممکن ہے آپ کو اپنی ان اداؤں کا اندازہ نہ ہو اور اندازہ ہو بھی کیسے سکتا ہے جب کہ نہ تو ان میں منافقت ہے نہ سیاست نہ مصلحت بلکہ یہ ادائیں آپ کی بےساختگی بن چکی ہیں۔ میں نے یہ مناظر دانستہ اس لئے پیش کر دیئے ہیں کہ ؎

وہ کیا دیکھ سکتے ہیں اپنی ادائیں
ہمیں دیکھتے ہیں جو ہم دیکھتے ہیں

آپ کے پاندان کی یاد میں ایک تازہ پان اپنے خاصدان سے نکال کر کھا رہا ہوں اور اس وقت آپ کا وہ تصور نگاہوں کے سامنے ہے جب آپ بہت ہی خلوص کے ساتھ میرے لئے پان بنا کر اس میں اپنا نہایت نفیس دانہ دار تمباکو ڈال کر اور گلوری بنانے کی کوشش میں سنبوسہ بنا کر بجائے مجھ کو دینے کے خود کھا جاتے ہیں اور پھر چونک کر لاحول پڑھتے ہوئے دوسرا پان بنا کر مجھ کو دیتے ہیں۔ پان سے آپ کو وہی شوق ہے جو ہر شریف آدمی کو ہونا چاہیئے اور سچ تو یہ ہے کہ ہم دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں اگر شعلۂ طور کا ایک ہاتھ ہے تو دوسرا ہاتھ آپ کے پاندان کا بھی ہے۔ اگر آپ اس اہتمام سے پان نہ کھاتے ہوتے تو معلوم نہیں آپ کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرنے کے لئے مجھ کو کتنے دن لگ جاتے ہیں نے آپ کی سرمستی کے زمانے میں بھی آپ کی خود فراموشی دیکھی ہے اور موجودہ عالمِ ہوش کی ہوشیاں بھی نظر کے سامنے ہیں مگر ان دونوں حالتوں میں اپنے پاندان سے آپ کبھی غافل نہ رہے۔

پاؤں اٹھ سکتے نہیں منزلِ جاناں کے خلاف
اور اگر ہوش کی پوچھو تو مجھے ہوش نہیں

جس وقت آپ کے سامنے پاندان کھل جاتا ہے اس وقت میری طرح آپ کا

بھی یہی عالم ہوتا ہے کہ ؎

سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے میخانے میں
خلد شیشے میں ہے فردوس ہے پیمانے میں

جگر صاحب۔ سچ تو یہ ہے کہ جو پان آپ ادھر آکر کھلتے ہیں یا جس پان کو ہم پان سمجھ بیٹھے ہیں اس کا بھلا پان سے کیا تعلق۔ پان تو نہیں پان کا دھوکہ کھا رہے ہیں۔ کھاتے ہیں یہ پان اور تصور کرتے ہیں اس پان کا جو میسر نہیں ؎

اس پردۂ رنگین پہ نظر آتا ہے جو کچھ
جیسے کہ یہ اک خواب ہے معلوم نہیں کیوں

شکر ہے کہ پان کی ایک "غنیمت" قسم لاہور میں ملنے لگی ہے جس کو بیچنے والے میٹھا پان کہہ کر بیچتے ہیں اور ہم اس کو صبر کے پھل والے درخت کا پتا سمجھ کر کھا لیتے ہیں۔ اس پان کو طبیعت نے گوارا کر لیا ہے مجبوری کا صبر ہے اور صبر نے عادت کی صورت اختیار کر لی ہے لہذا اسی پان کی ایک گلوری کیلئے پھر ہاتھ بڑھاتا ہوں اور یہ خط ختم کرتا ہوں۔

شوکت

عشرت رحمانی کے نام

گڑھی شاہو۔ لاہور

۲۰ر جون ۴۲ء

عشرت باقی!

میرے حصے کی جتنی عشرتیں اب تک فانی ثابت ہوئی ہیں ان میں آپ کا نام کہیں نظر نہیں آتا اور آپ کی یاد اس وقت کچھ اس طرح آئی ہے جیسے کسی درد میں تڑپنے والے کو کوئی دوا یاد آ جائے پھر میں آپ ہی کی طرح آپ کو "عشرتِ فانی" کیسے کہہ سکتا ہوں ؎

عشقِ ناکام! عشرتِ فانی
منہ تک آئی کہ بات ختم ہوئی

مگر آپ کو یاد دلانے کا باعث آپ کی اسی غزل کا ایک اور شعر ہے مگر اس

شعر سے پہلے اس شعر کے ذہن میں آنے کی تقریب کا تصور کر لیجیے کئی دن
سے یہاں وہ پان بھی نہیں مل رہے ہیں جن کا جوٹ اور پٹ سن کی نسل سے
دور کا کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ مزے میں تیزاب کے درخت۔ کہنے کو تو معلوم ہوتے
ہیں مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ اُن پر دیسی ہونے کی تہمت غلط ہے۔ یا زیادہ صحیح
یہ ہے کہ ان کو دیسی کہنا دیسی کی ہتک ہے۔ البتہ ع

گندم اگر بہم نہ رسد بھُس غنیمت است

کے مصداق ان کو زبردستی گوارا کر لیا ہے ؎

زیست کی ناکامیوں نے دل کو یہ سمجھا دیا
موت کو بھی زندگی کہہ کر گوارا کیجیے

وہ پان بجائے خود پان کے ماتم کی حیثیت رکھتے تھے مگر اب یہ ماتم بھی اپنے
حصے میں نہ رہا ؎

طبیعت ان دنوں بیگانۂ غم ہوتی جاتی ہے
مرے حصے کی گویا ہر خوشی کم ہوتی جاتی ہے

ان پانوں کے نہ ملنے سے وہی زندگی جو بستی پانوں کی گلوریوں سے ہے۔ سارا
حُسنِ شباب بنی ہوئی تھی اس قدر بے کیف ہو کر رہ گئی ہے کہ روزِ بروز دنیا
کی بے ثباتی کا دل قائل ہوتا جاتا ہے۔ ان حالات میں آپ کا یہ شعر حافظے میں
نہ اُبھرے تو کیا ہو ؎

زندگی اُف بہارِ حُسن و شباب
کس قدر بے ثبات ختم ہوئی

آپ کو اُس زندگی کی بے کیفی اور بے ثباتی کا تھوڑا بہت اندازہ ہو سکتا ہے جو بغیر پان کے بسر ہو رہی ہو۔ تھوڑا بہت میں نے اس لئے کہا کہ گو آپ پان کے بھی مانے ہوئے رسیا ہیں مگر پان کا غم سگریٹ سے بھی غلط کر سکتے ہیں بلکہ آپ کے یہاں تو پان اور سگریٹ کے پیہم دَور کچھ اس طرح چلتے ہیں کہ ؎

کبھی ہم سے کبھی غیروں سے شناسائی ہے
بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہرجائی ہے

جو سگریٹ کو پان کا نعم البدل یا کم سے کم حریف سمجھے اُسے میں کیونکر سمجھاؤں کہ صرف ایک پان کی کمی زندگی میں کتنا بڑا خلا پیدا کر دیتی ہے اس میں شک نہیں کہ خود آپ بھی جب پان کھانے پہ آتے ہیں تو بڑے ناز و نعم سے کھاتے ہیں مشکی اور بستی قوام کے مرتبان مہیا کئے جاتے ہیں زعفرانی پتی، مشکی دانہ۔ افشانی گولیاں۔ بے شمار قسم کی تمباکو سے آپ کا پاندان بھی ؏

کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجاست

کا منظر پیش کرنے لگتا ہے مگر وہ ہرجائی والی بات بھی غلط نہیں ہے۔ اسی اہتمام سے حقّے کا اہتمام بھی آپ کرتے ہوئے کڑھے جاتے ہیں اور یہی محویت

ہوتی ہے نت نئی سگریٹوں کے مچونکنے ہیں۔ آپ کے کمرے سے قوام کی خوشبو۔ سگریٹ کا دھواں اور حقے کی گڑگڑاہٹ کچھ اس طرح بہ آمد ہوتی ہے کہ غالب یاد آجاتا ہے ؎

بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل

جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

مگر یہاں تو زندگی کا ایک ہی سہارا ہے۔ پان اور صرف پان۔ وہ پان جو رفتہ رفتہ قصۂ پارینہ بنتا جاتا ہے اور زندگی کا اسلوب پیلے رنگ کا ہو رہا ہے اس موقع پر آپ ہی کا ایک شعر۔ جی نہیں مطلع آپ کو یاد دلاتا جاؤں ؎

حسن کا رنگ بگڑتا نظر آتا ہے مجھے

عشق اک قصۂ پارینہ سناتا ہے مجھے

کھانے کو سب ہی پان کھاتے ہیں اور ہونے کو آج بھی ہر گلی میں ایک آدھ پنواڑی کی دوکان موجود ہے مگر میرے لئے مصیبت یہ ہے کہ میں ہر درخت کے سبز پتے کو پان تسلیم نہیں کرتا۔ جو یہ گھاسے سبز آجکل پان کے نام سے بازار میں نظر آتے ہیں میں ان کو پان کہہ کر اپنے ذوقِ سلیم کو رسوا نہیں کر سکتا۔ یہ سبز پتے اور خواہ کچھ بھی ہوں مگر پان ہرگز نہیں ہیں۔ اگر دنیا ان کو پان کہتی ہے تو اس میں میرا قصور نہیں ہے ؎

غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

ایک رند بادہ نوش سے یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ ۔ ؎۔

اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ

مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ شراب کے بجائے لسی پی کر جھومنا شروع کر دے۔ میں نے ان سبز پتّوں کو چبانے کے بجائے گٹکا کھانا شروع کر دیا ہے مگر کس اہتمام کے ساتھ سڈول کتری ہوئی ڈلی جو باجرہ کہلاتی ہے۔ کیوڑے میں بسے ہوئے کتھے کی دودھیا خشک لوزات۔ موٹی موٹی سبز الائچیاں۔ سرد قد لونگیں شفاف چونا۔ پھر طرح طرح کے قوام اور تمباکو کبھی نقرئی گولیوں سے پان کا غم غلط کرتا ہوں کبھی طلائی گولیوں سے تسکین قلب کے سامان بہم پہنچاتا ہوں اور دل کو سمجھاتا جاتا ہوں کہ ؎

وہیں پہ برق گرتی ہے جہاں اپنا نشیمن ہو
کہاں تک اب بھلا ہم روز شاخِ آشیاں بدلیں

آپ کا کیا ہے پان اصل نہ ملے بنا سپتی کھا لیے سگریٹ پی لی۔ سگریٹ گولڈ فلیک نہ سہی تھری کیسل سہی تھری کیسل نہ سہی قینچی۔ بگلہ۔ پلیرس۔ مرچ۔ تار۔ کوئی نہ کوئی تو مل ہی جائے گی آپ کے ایسے ہرجائی کے لئے کیا کمی ہے جس کا قول یہ ہو کہ ؎

تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی

آپ تو پان سگریٹ۔ حقہ سب کچھ اس طرح استعمال میں لاتے ہیں گویا یہ تمام

چیزیں آپ کر استعمال کر رہی ہیں اور بحیثیت مجموعی مجھے تو آپ یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ ؎

مئے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیئے

مگر مجھ روسیاہ کو بیخودی نہیں بلکہ واقعی نشاط درکار ہے پھر خواہ میں اس نشاط کو بے خودی بنا ڈالوں۔

اس وقت میرے سامنے حیدرآباد کا وہ چھوٹا سا پاندان کھُلا ہوا ہے جو کتابی شکل کا ہے اور نہایت نفاست سے اُس میں تمام سامان رکھا ہوا ہے۔ میری عادت ہے کہ اگر چُونے کی ایک چھینٹ بھی پاندان کے کسی حصے پر پڑ جائے یا کتھے کا خفیف سا دھبہ بھی مجھ کو اس ظرف پر کہیں نظر آ جائے تو جب تک میں صفائی سے اس کو صاف نہیں کر لیتا اپنی خوراک بنانے میں تعجیل سے کام نہیں لیتا۔ میں چُونے کی کلھیا سے چونا بھی اس احتیاط سے نکالتا ہوں کہ اس کی سطح پر برہمی کے آثار نظر نہ آئیں اگر نفاست کے خلاف کوئی چیز بھی اس پاندان میں نظر آ جائے مثلاً کتھے سے لتھڑی ہوئی چمچی یا تماکو کی کلھیا میں چھالیہ کے دانے یا چونے کی چمچی پر کتھے کا کوئی داغ تو میرے لئے یہ ناممکن ہو جاتا ہے کہ میں نظم قائم کرنے سے پہلے اس انتشار کے باوجود وہ کیف حاصل کر لوں جو حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ میں بڑے دُلار اور بڑے چاؤ سے پاندان

کھولتا ہوں اور اس کی ترتیب اور نفاست سے اس رند کی طرح خوش ہونا چاہتا ہوں جو بلور کا شفاف جام اٹھا کر شراب ڈھالنے سے پہلے محض اس کے ذاتی حسن سے خوش ہوتا ہے اُس کو اٹھا کر نگاہوں کے سامنے اُس کی خنک بجلیاں چمکاتا ہے اور پھر اُس میں شراب ڈھال کر تڑپاتا ہے اور اس طرح ناز کرتا ہے گویا وہ خالق ہے اُس نے ایک حسین جسد میں اس طرح روح پھونکی ہے۔ شیشے سے پیمانے میں شراب کے آنے کا منظر کسی نے کیا خوب پیش کیا ہے ؎

ایک شعلہ سا گرا شیشے سے پیمانے میں
لو کرن پھوٹی سویرا ہوا میخانے میں

میں بھی پاندان کے سامنے پہنچ کر رند بن جاتا ہوں اور اپنا شیشہ و پیمانہ اسی پاندان میں دیکھتا ہوں، جو اس وقت بھی میرے سامنے ہے۔ اسی پاندان کے ایک چھپا نے ہوئے ڈھکنے میں اپنی خوراک بنا رہا ہوں۔ چھالیا میں تمباکو اس طرح ملا رہا ہوں گویا جن اور رومتھ کا کاکٹیل بنا رہا ہوں۔ ابھی اس تمباکو کے بعد قوام سے دو آتشہ کا لطف حاصل کرونگا۔ یہ موٹے موٹے پتے پان کے دھوکے میں کھا جانے والے اس رطل گراں کا اندازہ ہی نہیں کر سکتے اور اگر اس تمام تکلف کے ساتھ کہیں وہ پان بھی میسّر آجائے جس کے بغیر زندگی ادھوری ہو کر رہ گئی ہے پھر تو آپ مجھ سے قسم لے لیجئے کہ ہفت اقلیم کی بادشاہی

سے انکار کر جاؤں گا اور صاف کہہ دونگا کہ ؎

تم مرا دل مانگ لو دل کی تمنا مانگ لو
پان دے کر مجھ سے تم چاہو تو دنیا مانگ لے

آپ کو معلوم ہے کہ میری بیوی اس گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں جہاں میری شادی سے قبل دو وقت کھانے کے بعد پان کھایا جاتا تھا۔ تمباکو کا تو ذکر ہی بیکار ہے۔ پاندان کے قسم کی کوئی چیز نہ ان کو جہیز میں ملی نہ ان کے گھر میں کبھی مجھ کو نظر آئی مگر اس ایک رند کے فیض سے اب ہمارا گھر میخانہ بنا ہوا ہے۔ میری بیوی تو خیر مجھ سے کہیں زیادہ تمباکو نوش فرماتی ہیں مگر ان کی والدہ محترمہ سے لے کر ان کی ہمشیرہ عزیزہ تک سب ہی وہ پان کھانے کے عادی ہو چکے ہیں جو اس سے پہلے ان کے تصور میں بھی نہ آتا تھا۔ جی ہاں یہ بھی غلط نہیں کہتا ان کے تصور میں پان تو ضرور آتا ہوگا مگر وہ پان جس میں سونف الائچی۔ خوشبو کی گولیاں اور نہ جانے کیا کیا ڈالا جاتا ہے اور اس کو میٹھا پان کہا جاتا ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ لوگ براہ راست قلاقند کیوں نہیں کھا لیتے۔ یا پان میں بجائے ان چیزوں کے ایک گلاب جامن لپیٹ کر کیوں نہیں کھاتے اچھے خاصے منہ کو زچہ خانہ بنانے کی کیا ضرورت ناخوش آتی ہے۔ بجدا یہ میٹھا پان وہ نامعقول شے ہے جو اور خواہ کچھ ہو مگر پان ہرگز نہیں ہے۔ مجھ کو یہی اعتراض بعد پان کے اس گنگے پر ہے جس میں پستہ بادام کی ہوائیاں مختلف رنگوں سے سجا کر چکنی

ڈلی پر ورق نقرہ لپیٹ کر الائچی کو طلائی ورق میں ملفوف کر کے ایک خوبصورت سا گورکھ دھندا بنا دیا جاتا ہے اور نام ہے اُس کا گٹکا ۔ یہ چیز لکھنؤ میں ذرا بدلی ہوئی شکل کے ساتھ محرّم کے زمانے میں تیار کی جاتی ہے اور اس میں بھُنی ہوئی چھالیہ بھُنا ہوا کھوپرا بھُنا ہوا دھنیا ۔ الائچی کے دانے وغیرہ ملا کر اس کو گوٹا کہتے ہیں ۔ یہ سب چیزیں اپنی اپنی جگہ خواہ کچھ ہوں مگر ان کو پان سے کیا تعلق ۔ مجھ کو یہ چیزیں دیکھ کر شیخ سعدی کا وہ فقرہ یاد آ جاتا ہے "خطِ زشت است کہ بہ آبِ زر نوشتہ" ہیں ان میں سے چند مرکّب تو خیر چکھ بھی نہیں سکتا مثلاً وہ سونف اور مٹھی والا میٹھا پان ۔ مگر جو مرکب چکھ سکتا ہوں وہ ایک قسم کی مٹھائی یا حلوہ سمجھ کر اگر ان پر پان کا گمان بھی ہو تو کافر ۔

آج آپ کے یاد آنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ایک دوست ایران سے آئے ہیں اور کچھ ایرانی سگریٹ تحفۃً لائے ہیں ۔ یہ حق آپ کا ہے مختلف اقسام کے سگریٹوں کا البم آپ کا پڑا ہے ۔ آپ ڈھونڈھتے پھرتے ہیں نت نئے سگریٹ اور جب کوئی نئی قسم دریافت کر لیتے ہیں اس وقت آپ کے تیور واسکوڈی گاما سے کم نہیں ہوتے ۔ اس سگریٹ نوشی نے آپ کو جو نقصان پہنچایا ہے اس سے آپ بے خبر نہیں ہیں لیکن سگریٹ کے معاملے میں آپ رندِ بلانوش واقع ہوئے ہیں اور اس طرح آپ نے صحت کی جو قیمت لی ہے شاید اسی طرف اپنے اس شعر میں آپ اشارہ کر گئے ہیں ؎

پھولوں کی ناداں طلب میں

ہم نے کیسے کانٹے بوئے

مگر سگریٹوں کے تجربے جاری ہیں سگریٹوں کی تلاش اور اس تلاش میں آپ کی محویت کا تسلسل قائم ہے پھر ناحق آپ اس تجاہلِ عارفانہ سے کام لے رہے ہیں کہ ؎

کیا افتاد پڑی ہے عشرتؔ

کیوں رہتے ہو کھوئے کھوئے

بہرحال مجھے افسوس ہے کہ یہ ایرانی سگریٹ آپ تک نہیں پہنچا سکتا۔ البتہ آپ یاد آئے ہیں تو آپ کی اس یاد کے احترام میں اپنے لئے ایک خوراک اور بناتا ہوں تاکہ آپ کو ذرا مزہ لے لے کر یاد کرسکوں۔ قلمدان پیچھے کھسکا کر پاندان آگے بڑھا رہا ہوں اور یہ خط ختم کرتا ہوں۔

شوکت

فضل احمد کریم صاحب فضلی کے نام

گڑھی شاہو۔ لاہور
۲۵؍جون ۱۹۵۴ء

فضلی مکرم

مدت کے بعد اتنا لذیذ پان کھایا ہے کہ بے اختیار آپ کی مخاطبت میں کچھ دیر بسر کرنے کو جی چاہنے لگا۔ لکھنؤ سے ایک صاحب رحمت کا فرشتہ بن کر آگئے ہیں اور اپنے ساتھ جتنے پان لائے ہیں وہ سب میرے ذوقِ سلیم نے ضبط کر لئے ہیں۔ اُن ہی میں کی ایک تازہ گلوری کھا کر آپ کو یاد کر رہا ہوں اور آپ سے باتیں کرنے کو "چشمِ غزال" لئے بیٹھا ہوں۔ آپ کے کلام کا یہ مجموعہ ۱۹۵۳ء کی اردو مطبوعات کی ملکہ ہے اور یہ واقعہ ہے کہ آج کل طباعت کی دنیا میں — ع —

حسنِ سادہ اس کا ہے ضرب المثل

جہاں تک آپ کے کلام کا تعلق ہے اس کا تو خیر میں دلدادہ تھا ہی مگر اس سلیقے سے مجموعۂ کلام چھاپ کر اُردو مرکز نے بھی چشمِ غزال کی حرمت رکھ لی۔ آپ کے متعلق میری ہمیشہ سے یہ رائے ہے کہ اگر آپ اس خلوص سے پان نہ کھاتے ہوتے تو آئی۔سی۔ایس یا سی۔ایس۔پی تو ضرور ہوتے مگر شاعر نہ ہوتے۔ ایک پچھلے آئی۔سی۔ایس اور موجودہ سی۔ایس۔پی کی حیثیت سے آپ کے شفاف دانتوں میں ایک پائپ دبا ہونا چاہیئے تھا تاکہ جب اس کیفیت کے ساتھ آپ اُردو بولیں تو اُس پہ انگریزی کا قبضہ ہو۔ تیور اتنے کڑے ہونا چاہیئے تھے کہ ان پہ زبردستی اقبال برستا نظر آتا اور جو دیکھتا وہ ہاتھ جوڑ کر عرض کرتا کہ ؎

یہ ہر گھڑی عتاب کیوں بہاں کسے کلام ہے
حضور پھر حضور ہیں غلام پھر غلام ہے

مگر یہ بھی خدا کی شان کہ آکسفورڈ میں تعلیم پانے کے بعد بھی ولایت کی ہوا کھانے کے بعد بھی امریکہ پیمائی کر آنے کے بعد بھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آئی۔سی۔ایس اور سی۔ایس۔پی قسم کے آدمی بن جانے کے بعد بھی آپ پان کھاتے ہیں۔ ورنہ اگر سچ پوچھئے تو سی۔ایس۔پی بن جانے کے بعد آدمی صحیح معنوں میں اشرف المخلوقات بن جاتا ہے اور یہ پان وغیرہ اس کے معیار سے پست ہو کر ایک عام آدمی کی بیچارگی کے چارے سے زیادہ اور کوئی حیثیت نہیں رکھتے اُس کے شایانِ شان

تو وہ ولایتی گوند ہوتا ہے جو جبڑوں کی ورزش کے لئے وہ استعمال کرتا ہے طلب کے طور پر سگار۔ پائپ۔ اور اعلیٰ سے اعلیٰ قسم کے سگریٹ ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ مگر اس طلب کاذب اور ہماری طلبِ صادق میں وہی فرق ہے جو آپ نے عشق اور ہوس میں بیان کیا ہے ؎

فرق عشق و ہوس میں ہے پیارے
ایک ایمان دوسرا الحاد

خدا کا شکر ہے کہ آپ سی۔ ایس۔ پی بھی رہے اور آدمیت کی حد سے بھی نہیں گذرے۔ ع

رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

کس قدر پیار آتا ہے مجھے جب میں آپ کو گلوری کی نوک پر قوام لگا کر کھاتا ہوا دیکھتا ہوں اور کس قدر معطّر محسوس ہوتے ہیں وہ شعر جو آپ پان کھا کر سناتے ہیں۔ آپ کے کلام کی سادگی میں پرکاری اس رنگین مزاجی نے پیدا کی ہے جس کو میں براہِ راست پان کا فیضان سمجھتا ہوں۔ یہ پان ہی تو ہے جس نے آپ کو مغربی علوم حاصل کرنے کے باوجود مشرقیت کا دلدادہ بنائے رکھا۔ مشرقیت اور مشرقی ادا شناسی آپ کے کلام میں کہاں نہیں جھلکتی۔ اس بیساختگی سے یہ تصویر آکسفورڈ کا ہر طالب علم پیش نہیں کر سکتا کہ ؎

ابھی تو ابھی نہیں نگاہیں مگر وہ گھبرائے جا رہے ہیں
ضرور کچھ رنگِ رخ نے ان سے کہا ہے میری نظر سے پہلے

جس ملک میں آپنے تعلیم حاصل کی ہے وہاں محبوب کو گھبرانا نہیں آتا بلکہ محبوب ہی دوسرے کو گھبرا دیتا ہے۔ وہاں نہ رنگِ رُخ کچھ کہتا ہے نہ نظر کچھ کہتی ہے بلکہ جو کچھ کہنا ہوتا ہے طالب و مطلوب خود ہی کہہ سُن لیتے ہیں اور آپ کو تو تجربہ ہونا چاہیئے کہ وہاں اس قسم کے معاملات میں دراصل کہنے سُننے کی گنجائش بھی ذرا کم ہی ہوتی ہے۔ تابِ نظّارہ۔ جرأتِ اظہار اور عرضِ مدعا قسم کی دقیانوسی چیزیں شاید ہی وہاں کے کسی قدامت پرست عاشق کو مطلوب ہوتی ہوں اور نہ وہاں یہ صورتِ حال ہو سکتی ہے کہ ؎

ہم گئے تھے عرض کرنے مُدعا　　　اور عرضِ مدّعا ہی رہ گیا

البتہ یہ شعر وہاں کے حالات پر یوں صادق آسکتا ہے عرضِ مدعا کے لئے گئے تو تھے مگر عرضِ مدعا اس لئے رہ گیا کہ بغیر اس تکلف ہی کے کام چل گیا مختصر یہ کہ ؎

مشاطگیٔ فلسفۂ مغربی نہ پُوچھ
زلفِ خیال اور پریشاں ہے آجکل

عرض کرنے کا مطلب یہ کہ آپ کو یاں نے شاعر اور شاعری نے مشرق پرست کچھ ایسا بنا یا ہے کہ کسی ایس۔ پی ہونا آپ پر تہمت معلوم ہوتا ہے۔ سگار کے دھوئیں میں لپٹی ہوئی انگریزی تو بہت سُنی ہے بلکہ سچ پوچھئے تو اسی سے اگست سنہ ۴۷ء میں نجات حاصل کی ہے مگر روح میں بالیدگی تو

آپ کے لب ہائے رنگین سے وہ معطر کلام سنگ پیدا ہوتی ہے جو قوام لگی ہوئی گلوری
کھا کر آپ سناتے ہیں ے

ہر اک سانس میں ان کے پھولوں کی خوشبو
دل و جاں معطر ہوئے جا رہے ہیں

خدا جانے آپ اپنے اس ذوق کی تکمیل کیسے کر لیتے ہیں مجھ فرہاد کو تو روز اپنے
پاندان تک جوئے شیر لانا پڑتی ہے۔ پان کا تو ذکر ہی نہ کیجئے وہ تو ہوائی رزق
بن گئے ہیں کبھی کوئی بھولا بھٹکا مہمان ادھر آ نکلا تو تحفہ کے طور پر چند پان بھی
آجاتے ہیں ورنہ وضو کی جگہ عموماً تیمّم ہی کرنا پڑتا ہے اور اس خشک گٹکے
پر قناعت کرنا پڑتی ہے جس کے تمام اجزا بھی بمشکل دستیاب ہوتے ہیں
صحیح قسم کی ڈلی ڈھونڈھنا پھر اس کو منتوازن اور سڈول کٹوانا بجائے خود
ایک کام ہے۔ زندہ قسم کی الائچیاں ڈھونڈھنے ہی سے ملتی ہیں۔ پھر آپ
تو جانتے ہیں کہ ہر قسم کا کتھا بھی کھانے کا نہیں ہوتا اور تمباکو کی تلاش تو آپ
یقیناً جانتے ہوں گے کہ آب حیوان کی تلاش سے کم نہیں۔ عجیب عالم ہے
اپنا کہ لوگ پاکستان میں سونے چاندی کو ہے اور کوئلے کی کانیں ڈھونڈھتے
پھرتے ہیں اور ہم تمباکو کے جنون میں سرگرداں ہیں۔ بمشکل تمام اگر یہ تمام اجزا
مل بھی گئے تو گراں اس قدر کہ اپنی اوقات سے کچھ باہر ہوتا جا رہا ہے
یہ شوق ے

اسبابِ زندگی کی ہر اک چیز ہے گراں
بس ایک زندگی ہے کہ ارزاں ہے آجکل

مگر کیا واقعی اُس زندگی کو زندگی کہا جا سکتا ہے جو بغیر پان کے ایک عجیب قسم کی بے بسی بنی ہوئی ہے۔ مجھے آپ کا تو علم نہیں مگر اپنا اندازہ ہے کہ میں اپنی زندگی میں اُس دن کو شامل ہی نہیں سمجھتا جس دن مجھ کو پان نہ سہی مگر صحیح قسم کا گٹکا بھی میسر نہ ہو۔ اور اب تو ایسے دن اکثر آ جاتے ہیں کہ صحیح قسم کا تمباکو حسبِ منشا نہ ہو سکا اور مجبوراً جو مل گیا وہ کھا لیا۔ مگر اس قسم کے نحس دنوں میں میرا عالم یہ ہوتا ہے کہ جیسے مجھ پر کوئی حادثہ گذر گیا ہے یا میں بیمار ہوں۔ طبیعت چڑچڑی سی رہنے لگتی ہے۔ خانہ جنگیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ زندگی میں تلخیاں گھر کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ راتیں بے کیف ہو جاتی ہیں اور صبح جب اس احساس کے ساتھ اُٹھتا ہوں کہ آج پھر بھی بیہودہ تمباکو کھانا ہے تو اس صبح کا عالم بقول آپ کے کچھ ایسا ہوتا ہے کہ ؎

صبح بے نور سی، بے رنگ سی، بے جان سی ہے
رات کے سانپ نے جیسے کہ ڈسا ہے اس کو
مُردنی ُمیری نگاہوں میں ہے ایسی نقشِ ستی
مُردار ہو جائے وہی آج یہ کچھ لیں جس کو

اور یہ واقعہ ہے کہ خود ہی کے ان دنوں کو میں اپنی زندگی میں شامل کر کے

زندگی کی توہین کرنا نہیں چاہتا۔ ایک عجیب بیزاری سی طاری رہتی ہے اور
میری تمام کیفیت آپکے اس شعر میں سمٹ کر رہ جاتی ہے کہ ؎

بے دلی کا ان دنوں عالم نہ پوچھ
کچھ بھی کرنے کو نہیں جی چاہتا

کچھ عجیب رمضان شریف کی سی کیفیت طاری رہتی ہے کہ قلم اُٹھانے کو تو
اُٹھا لیا مگر اب سمجھ میں نہیں آتا کہ قلم اُٹھانے کا مقصد کیا تھا پاجامے میں
ازار بند ڈالنا تھا۔ کسی کو خط لکھنا تھا یا کیا۔ البتہ اگر پاندان سجا ہُوا ہے
اور اس میں ہر چیز اپنے ذوق کے مطابق ہے پھر کیا پوچھنا ؎

پھر دیکھیے اندازِ گُل افشانیٔ گفتار
رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

اور اُس وقت اسی قلم کی تیزیاں غیب سے وہ مضامین خیال میں لاتی ہیں کہ واقعی
بقول غالب سر بر خامہ پر نوائے سروش کا گماں گذرتا ہے۔ اس وقت آپ سے
اس نصف ملاقات کی تحریک بھی آخر ان ہی پانوں نے پیدا کی ہے جو لکھنؤ سے
خدا جانے میری کس خوش اعمالی کے صلے کے طور پر آ گئے ہیں چنانچہ میز پر
دہنی طرف پاندان کو جگہ دی ہے کہ اس کی اوّلیت اسی کی مستحق ہے قلم و کاغذ
کو بائیں طرف رکھا ہے کہ اس وقت وہ دوسرے درجہ پر آتے ہیں لیکن میرے
سامنے اس وقت آپ کی "چشمِ غزال" ہے۔ کئی گلوریاں کھا کر آپ کو یہ خط لکھا

ہے اور اب ایک تازہ گلوری کھا کر قوام سے اُس کو مہکا دُنگا اور پھر آپ کی یہ غزل جو خدا جانے کیوں مجھے بے حد پسند ہے گنگناؤنگا اور اپنی روح کو سناؤنگا

حسن تو اب یہ شیخ کی کہ اٹھا ہے جی
پارسا تھا پارسا ہی رہ گیا

اس نے اس انداز سے دیکھا مجھے
دیکھ کر میں دیکھتا ہی رہ گیا

ملاحظہ فرمائیے یہ عالم اور غور فرمائیے اس دخل در معقولات پر کہ میرے ایک بد مذاق ندیم خاص پان نوشی کی کثرت کے نقصانات گنوانے بیٹھ گئے ہیں سے

یہ ساقی مہر وش یہ فضا یہ شب مہ
اور شیخ یہ کہتا ہے کہ پینا ہے گناہ

کیا وسوسہ شیطان نے ڈالا دل میں
لاحول ولا قوۃ الّا باللّٰہ

شوکت

سیّد محمد جعفری کے نام

گڑھی شاہو۔ لاہور

۲۷؍ جون ۵۴ء

سیّدی!

وہی صبح نو بجے کا سہانا وقت ہے ہر طرف دھوپ پھیل چکی ہے اور میں بستر پر دھوپ اور غنودگی میں بیک وقت ڈوبا پڑا ہوں۔ شکوہ ہے آفتاب سے کہ اس قدر تڑکے طلوع ہونے کی آخر کیا ضرورت تھی۔ شکایت ہے اُن بھنکنے والی مکھیوں سے جو اتنا اخلاق بھی نہیں برتتیں کہ کم سے کم سونے والے کے منہ پر تو نہ بیٹھیں۔ نیند کے کیا کیا ارمان ہیں جن کا خون ہو رہا ہے۔ جس صحن میں میرا بستر ہے اُس کے ایک گوشے میں کوڑے کا ڈھیر ہے۔ داہنی طرف ایک نالی رواں ہے جسے نہ جانے کب سے صاف

نہیں کیا گیا۔ اس کا سیاہ گاڑھا پانی میلے اٹھاتا دور تک چلا گیا ہے۔ بائیں طرف رات کے جھوٹے برتنوں کا ڈھیر ہے۔ اپنی کچی نیند کا غم غلط کرنے کیلئے پان کھا رہا ہوں اور آپ کو یاد کر رہا ہوں۔ اس ماحول میں آپ کی یاد تازہ کرائی ہے آپ کی اس نظم نے جس کا عنوان تھا "بھنگیوں کی ہڑتال" ؎

بھنگیوں کی آج کل ہڑتال ہے
کہتر و مہتر کا پتلا حال ہے

میں نے ایک انگڑائی لیکر پاندان قریب کھسکایا۔ ایک تازہ گلوری بناکر منہ میں رکھی اور اپنے خیالات میں ڈوب گیا تاکہ پسینے میں ڈوبنے کا احساس نہ ہو۔ بے ساختہ جی چاہنے لگا کہ کچھ دیر آپ کی مخاطبت میں بسر کروں۔ چنانچہ اس وقت آپ سامنے ہیں اور میں آپ ہی سے باتیں کر رہا ہوں۔ شاید آپنے کبھی اس مسئلہ کو قابلِ توجہ نہ سمجھا ہو کہ ہم اپنے پندارِ کہتری میں مبتلا ہو کر مہتر کو حقارت سے مہتر تو کہہ دیتے ہیں مگر اسی مہتر کے دم سے کہتر بنے ہوتے ہیں اور ہماری بھی کہتری کس شدت کے ساتھ ان مہتروں کی محتاج ہے۔ آپ نے اس مسئلہ پر صرف ایک مرتبہ سنجیدگی سے غور فرما کر ایک مزاحیہ نظم کہہ ڈالی تھی مگر غور کیجئے تو یہ حقائق صرف قہقہوں میں اڑا دینے کے لئے نہیں ہوتے ان کے لئے مزاحیہ نہیں بلکہ قومی نظموں کی ضرورت ہے جس میں کھلا ہوا اعتراف ہو اپنے ہی ان خدمت گزاروں کی اہمیت کا۔ صرف آج ہی جمعدارنی اب تک نہیں آئی ہے

اور گھر کا عالم یہ ہے کہ شرافت ڈانواں ڈول نظر آتی ہے۔ نفاست مُنہ چھپاتی پھر رہی ہے۔ پاکیزگی قابلِ توجہ محکمہ حفظانِ صحت بن چکی ہے، ابھی جمعدارنی آجائے گی یہ تمام گندگی صاف کر دے گی اور ہم کو ہماری شرافت۔ ہماری نفاست اور ہماری پاکیزگی بخش دے گی۔ غور کیجئے کہ اس نے ہماری اسی شرافت اسی نفاست اور اسی پاکیزگی کو برقرار رکھنے کے لئے اپنے کو کیا بنا رکھا ہے آپ کہیں گے کہ وہ اسی کا معاوضہ لیتی ہے۔ شرط انصاف ہے کیا وہ کام جو باوجود کوشش کے آپ نہیں کر سکتے اس کا آپ اس کو منصفانہ معاوضہ دیتے ہیں فرض کر لیجئے کہ مہتر واقعی ہڑتال کر دیں۔ وہ طے کر لیں کہ یہ کام ہی نہ کریں گے تو کیا آپ بڑے سے بڑا معاوضہ دے کر بھی یہ کام کسی سے لے سکتے ہیں۔ بظاہر یہ کوئی اہم ضرورت نہیں مگر اس کی اہمیت کا اسی لئے تو اندازہ نہیں ہوتا کہ اس قسم کی خدمات انجام دینے والے خود اپنی اہمیت سے بے خبر ہیں دو دن اگر وہ ہاتھ کھینچ لیں تو میرے اور آپ کے دولتکدے کا یہ حال ہو جائے کہ ؎

بوئے گل۔ نالۂ دل۔ دودِ چراغِ محفل

جو تری بزم سے نکلا وہ پریشاں نکلا

بلکہ آپ خود بھی اپنی بزم سے پریشان ہو کر نکل جائیں اور جس گھر کو آپ فخر سے اپنا گھر کہتے ہیں جس کی صفائی اور پاکیزگی کو آپ اپنی نفاست پسندی کا نمونہ سمجھتے ہیں اُسی گھر کے متعلق آپ کہہ اُٹھیں کہ ؎

محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے
کہ موجِ بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

برائے نام تنخواہ پر یہ جہتم بالشان کام کرنے والے۔ ہماری گندگی سمیٹ کر ہم کو ستھرا رکھنے والے۔ خود ذلیل بن کر ہم کو شریف بنانے والے ہمارے یہی محسن کس قدر سادہ لوح ہیں کہ ان کو اپنے اس احسان کا بھی احساس نہیں بلکہ وہ ہم ہی کو اپنا محسن سمجھتے ہیں کاش وہ یہ اندازہ کر سکتے کہ جو خدمات وہ انجام دیتے ہیں وہ کسی اور کے بس کی نہیں۔ کاش ان کو معلوم ہوتا کہ ہماری یہ نفاست انہی کی بخشش ہے اور وہ اگر اپنے اسی ذلیل پیشے کو چند دن کے لئے بھی ترک کر دیں تو ہماری اس نجابت۔ شرافت۔ سفید پوشی اور نفاست پسندی کی ساری قلعی کھل جائے اور یہی غیر اہم خدمات اپنی اہمیت کی پوری شدّت کے ساتھ ہمارے سامنے آجائیں اور ہم سے کہلوا لیں کہ ؎

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

آپ بھی کہیں گے کہ میں نے یہ کیا ذکر آپ سے چھیڑ رکھا ہے اور اس موضوع پر آپ سے کیوں بات کر رہی ہوں مگر اس کا کیا علاج کہ آپ کی وہی نظم جو آج ذہن میں اُبھری ہے اس ذکر کا صحیح مخاطب صرف آپ ہی کو ثابت کرتی ہے اور اس باب میں آپ سے اندیشہ نہیں ہے کہ ؎
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا

سچ پوچھئے تو یہ معاملہ اس قدر نازک ہے کہ غیر ہی کو آزمانا پڑتا ہے اور اس باب میں خود اپنے اوپر اعتماد مشکل ہو سکتا ہے۔ جب اپنی یہ محتاجی پیشِ نظر ہے تو کس منہ سے کہا جائے کہ ہم خود کفیل ہیں۔ یہاں ذکر میں خود اپنا کر رہا ہوں ممکن ہے آپ نے اس محتاجی سے مفر کی کوئی صورت پیدا کر لی ہو۔ محتاجی سے فطرتاً بیزار ہوں۔ کسی کا دستِ نگر بننا اپنی خودی کی موت سمجھتا ہوں۔ مگر یہ محتاجی وہ ہے جس کا کوئی علاج سمجھ میں نہیں آتا۔ اگر ہو سکے تو آپ ہی اس میدان میں بے نیازی کا ثبوت دے کر ایک مثال قائم کریں۔ ؎

گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت دعا نہ مانگ
یعنی بغیر یک دلِ بے مدعا نہ مانگ

دھوپ تیز ہو رہی ہے پان ختم ہو رہا ہے نشہ ہرن ہی نہیں بیسہ ہرن بن چکا ہے لہٰذا یہ بحث پھر کبھی سہی۔

شوکت تھانوی

مولانا ابوالکلام آزاد کے نام

گڑھی شاہو۔ لاہور
یکم جولائی ۱۹۵۳ء

سیدی و مولائی!

وہی صبح نو بجے کا جان لیوا وقت ہے دھوپ ہر طرف پھیل چکی ہے جس کی ہلکی ہلکی آنچ میں محسوس کر رہا ہوں۔ بستر پہ لیٹا ورزش کر رہا ہوں جس کو اصطلاح عام میں انگڑائیاں کہتے ہیں۔ آنکھیں کھلی ہوئی ہیں مگر نیند کا ارمان باقی ہے۔ کاش کچھ دیر اور سو سکتا مگر اب نیند آنکھوں سے طوطا چشمی کر رہی ہے۔ ناچار اٹھ بیٹھا اور پاندان کی طرف دستِ طلب بڑھا دیا۔ میں اس پہلے پان کو صبوحی کہتا ہوں اور اس پان کو بنانے میں خاص اہتمام سے کام لیتا ہوں پان کے پتّے پر کتھا اور چونا اس احتیاط سے

لگتا ہوں جیسے کوئی ماہر مصوّر اپنے کسی حاصل زندگی نقش میں رنگ بھر رہا ہو۔ برگ سبز پر کتھے اور چونے کا توازن درست کرکے اس کو اپنے سامنے رکھے بیٹھا ہوں کہ چند منٹ گذر جائیں اور کیف و توازن اپنے معیاری درجے پر آجائے تو سڈول ترشی ہوئی چھالیہ اس پر ڈالوں، الائچی کے دانے اس پر سے نچھاور کر دوں۔ قوام کا قشقہ اس کی پیشانی پر لگاؤں۔ نظر بد سے بچانے کے لئے تمباکو کے کالے دانے اس پر سے واروں، گلوری بناؤں اور اس گلوری سے اپنی بے رنگ زندگی کو رنگین بنانے کی کوشش کروں۔

آج کا اخبار سامنے ہے اور اس کی ایک جلی سرخی اپنی طرف متوجہ کر رہی ہے کہ "اردو کا بھارت سے کوئی تعلق نہیں" میں اس سرخی کو پڑھنے کے بعد اس خبر کو پڑھنے کے لئے بے چین نہیں ہوں اس لئے کہ مجھ کو معلوم ہے کہ یہ بھارت کے کسی فرقہ پرست رہنما کے کسی ارشاد کا کوئی ٹکڑا ہے اس قسم کے ارشادات کا شور خود آپ کی سماعت کے قریب بھی آتا ہی رہتا ہوگا اور بھارت کی بے آسرا اردو بارہا آپ سے بھی کہہ چکی ہوگی کہ ؎

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

اردو سے آپ کو اور آپ سے اردو کو جو وابستگی ہے اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں اگر سچ پوچھئے تو آپ کی زندگی بھر کی کمائی اردو ہے اور

اُردو کا سرمایۂ زندگی ابوالکلام ہے۔ اطمینان تھا تو صرف یہی کہ ہندوستان میں
اور کچھ ہو یا نہ ہو مگر اُردو کے لئے ابوالکلام موجود ہیں اُردو آپ کے لئے
زبان کا نہیں بلکہ دل کا معاملہ ہونا چاہیئے تھا مگر آپکے ہوتے ہوئے بھارت
میں اُردو کو جو دن دیکھنا پڑ رہے ہیں اس سے آپ کا دل کیوں نہیں ہلتا۔
اردو کی اس کس مپرسی پہ اور تو اور ابوالکلام کیوں خاموش ہیں۔ اگر آپ ہی کے
دل میں اُردو کے لئے کوئی جگہ نہیں تو بھارت کے کسی گوشے میں اُس کیلئے
جگہ ڈھونڈھنا ہی بیکار ہے۔ اُردو اپنے لئے آپکے دل کا لگاؤ چاہتی ہے
آپ کی زبان کے چٹخارے نہیں۔ ؎

نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

آپکے ہوتے ہوئے اُردو کا گلا گھونٹا گیا اور آپ ابوالکلام ہوتے ہوئے
بھی چپ رہے۔ خود آپ کو بجائے وزیرِ تعلیم کے شکشا منتری کہا گیا اور آپنے
اس پر کوئی اعتراض نہ کیا۔ اُردو کی ملک گیری اُس سے آپ ہی کے زیرِ سایہ
چھنی اور آپ کچھ نہ بولے۔ اُردو سر برہنہ اپنی علاقائی حیثیت کی بھیک
مانگنے سر بازار نکلی اور اُس کی جھولی میں یہ خیرات بھی آپسے نہ ڈالی گئی۔ مگر یہ
بھی سچ ہے کہ ہم کو کیا معلوم کہ خود آپکے دل پر کیا عالم گذر رہا ہے۔ خدا جانے
اُردو کی اس بے سروسامانی پر آپ کا دل کس حد تک خون ہو چکا ہے۔ نہ جانے
کس مجبوری نے ابوالکلام کو اب تک مہر بلب رکھا ہے ؎"

کیوں بدگماں ہوں دوست سے دشمن کے باب میں

اُردو کے مقابلے میں جو سنسکرت آمیز بلکہ سراپا سنسکرت ہندی بھارت کی زبان بنائی جا رہی ہے وہ آپ کو ابو الکلام تو خیر کیا رہنے دینی آپ کی آگہی کو بھی اس حد تک مفلوج کر دے گی کہ آپ خواہ کیسا ہی "دام شنیدن" بچھائیں عالم تقریر کا مدعا عنقا ہی رہے گا وہ زبان جو آجکل آپکے ملک کی نشری زبان بنی ہوئی ہے۔ وہ آل انڈیا ریڈیو کے خبروں کی زبان ہم تو خیر کیا سمجھتے ہم کو یقین ہے کہ خود آپکے پلے بھی بمشکل ہی پڑتی ہوگی۔ ہندوستان کی اکثریت اس زبان کو سمجھنے سے آج قاصر ہے ؎

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمھاری شرابِ طہور کی

اس زبان کی ترویج اور ترقی میں آخر کہاں تک سرکاری ہاتھ نہ ہوگا۔ وزارتِ تعلیم کیونکر اس سے بے تعلق رہی ہوگی اُردو کی جگہ ہندی کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی منظوری آخر کس نے دی ہوگی ؎

خدا کے واسطے پردہ نہ کعبہ سے اُٹھا ظالم
کہیں ایسا نہ ہو یاں بھی وہی کافر صنم نکلے

شکشا منتری کو بھی پرشوتم داس ٹنڈن ہونے کوئی سمپورنانند ہونے تو اُردو کو شاید کوئی شکوہ نہ ہوتا شکوہ ہے اُردو کو اپنے ایک سپوت سے۔

اُس سے جس پر اُردو کو کیا کیا ناز تھے کہ کبھی وہ الھلال میں اِترائی کبھی غبارِ خاطر میں اٹھلائی اور آخر اُن ہی ہاتھوں سے آج مُنہ کی کھائی۔ مگر سوال یہ ہے کہ یہ باتیں میں آپ سے کیوں کہہ رہا ہوں۔ کس اُمید پر کہہ رہا ہوں ؎

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالبؔ
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

بیشک آپ کی مجبوریاں بھی پیشِ نظر ہونا چاہئیں۔ آپ یقیناً ایک با اختیار مجبور ہیں۔ آپ ایک پابند آزاد ہیں۔ آپ کی سیاسی ہر دلعزیزی بھارت میں آپ سے یہی قربانی چاہتی ہے کہ آپ اپنی اس زبان کو بھی اپنی کرسی پر بھینٹ چڑھا دیں جس کے آپ ابوالکلام ہیں۔ آپ سے اُردو کشی کیلئے کسی نے ممکن ہے کچھ نہ کہا ہو مگر آپ خود بڑے رمز آشنا ہیں ؎

پرسشِ طرزِ دلبری کیجئے کیا کہ بن کہے
اُس کے ہر اک اشارے سے نکلے ہے یہ ادا کہ یوں

میں خود بھی بے کیف ہوا اور آپ کو بھی یہ بحث چھیڑ کر بے کیف کیا۔ میں پان کھاتا ہوں آپ چینی چائے کا جام اُٹھائیے۔

شوکت تھانوی

۲

گڑھی شاہو - لاہور
۲ر جولائی ۱۹۴۵ء

سیّدی و مولائی !

کل کا مکتوب کاغذ پر ختم ہو گیا تھا مگر دماغ میں ختم نہ ہوا تھا۔ اس وقت قلم اُٹھایا تو خیالات پھر اُسی رُخ پر بڑھنے لگے۔

یہ تو اطمینان ہے کہ اُردو کو اُس آسانی سے نہ مٹایا جا سکے گا جس آسانی سے اس کو مٹا دینے کے منصوبے بنا لئے گئے ہیں۔ اس میں اُردو کی سخت جانی کو اتنا دخل نہیں جتنا اُس کی حریف زبان کی اجنبیت قصور وار ہے وہ زبان جو اُردو کی جگہ لائی جا رہی ہے خود ان کے لئے بھی اجنبی ہے جن کی وہ

زبان کہلاتی ہے۔ ہندی ان کے ارادے۔ عزم۔ اور قصد کی زبان تو بن سکتی ہے مگر ان کی بیساختگی کی زبان کبھی نہ بن سکے گی اور ان کو اعتراف کرنا پڑے گا کہ ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

ہندی ان کی سرکاری زبان بیشک بن جائے گی اس لئے کہ آخر انگریزی بنی ہی تھی مگر ان کی نجی اور گھر بلو زبان نہ بن سکے گی وہ شدت کرب سے ہندی میں آہ و بکا نہ کر سکیں گے۔ وہ خلوت میں ہندی کو محبت کی زبان نہ بنا سکیں گے۔ وہ خواب ہندی میں نہیں بلکہ اُردو ہی میں دیکھیں گے جب وہ کہیں گے تکلف برطرف تو بے تکلفی کی زبان اُردو ہی ہوگی۔ اپنے اچھے خاصے باپ کو پتا کہنے والے جب ٹھوکر کھا کر گریں گے تو ان کی زبان سے "باپ رے باپ" ہی نکلے گا " پتا رے پتا " وہ کبھی نہ کہیں گے۔

اُردو کو تو بہر حال آپ کے بھارت میں بھی مر مر کر زندہ رہنا ہی ہے مگر اُردو کی تاریخ اس کو کبھی نہ بھلا سکے گی کہ جس وقت اُردو کو زندگی کی آغوش سے چھین کر موت کے منہ میں ڈالا جارہا تھا تماشائیوں میں اُردو کے جلیل القدر فرزند ابوالکلام بھی تھے جن کی منصبی مصلحت ان کو خاموش کئے ہوئے تھی حالانکہ اُسی وقت پنڈت آنند نرائن ملا اُردو کی تاریخ

کا یہ ورق لکھ رہے تھے کہ ؎

یہ سانحہ سالِ چہل و نویں ہوا | ہندی کی چھری تھی اور اردو کا گلا
اُردو کے رفیقوں میں جو مقتول ہوئے | مُلّا نامی سُنا ہے شاعر بھی تھا

اور اسی وقت جگن ناتھ آزاد اسی بھارت میں اُردو کی رام کہانی سنا رہے تھے ؎

ملے ہندوستانی سے جو باہم ترک و ایرانی
تو مشکل ہو گئی اک دوسرے کو بات سمجھانی
بہت مشکل نظر آیا یہ باہم ربط کا عالم
"زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم"
خلوصِ قلب سے لیکن یہ مشکل حل ہوئی آخر
نئی اک گفتگو کی طرز دونوں کو ملی آخر
یہ طرزِ گفتگو آزاد کچھ ایسی حسین نکلی
کہ ان دونوں زبانوں سے زیادہ دلنشیں نکلی
کیا اُردو بالآخر وقت نے تجویز نام اس کا
مروّت اس کا شیوہ تھا جہانگیری تھا کام اس کا

یہ آزاد، آزاد تھا اور ایک آزاد وہ تھا جسے بااختیاریوں نے مجبور کر رکھا تھا جس نے اپنی سہاگن اُردو کو اپنے ہی سامنے بیوگی کے عالم

ہیں دیکھا اور کچھ نہ کہا ؎

فسردہ ہوتے ہوئے ڈالیوں پہ پھولوں کو
خود اپنی آنکھ سے دیکھا ہے اور خزاں ہیں نہیں

مگر اُردو کے مورخ کو یہ بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ مقابلہ سخت تھا ایک طرف بے سہارا اُردو تھی اور دوسری طرف اقتدار کی مسند، ایک طرف حکومت تھی اور دوسری طرف صرف محبّت مگر زبان سے اس محبّت کا تصادم مشرب کی محبت سے تھا اور اس وقت تھا جب عالم یہ تھا وارفتگی کا کہ ؎

چھوڑوں گا میں نہ اس بتِ کافر کو پوجنا
چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر

جس رفاقت پر بیگانوں کے لئے یگانے قربان ہو سکتے ہیں جس عقیدت پر ایمان بھی بالائے طاق رکھا جا سکتا ہے اسی قربان گاہ پر اگر اُردو کو بھی پہنچا دیا تو کیا تعجب ہے۔

خیر چھوڑیئے اس تکلیف دہ ذکر کو یہ خلش اگر خود آپ کے دل میں پیدا نہ ہو سکی تو ہم ایک تیر نیم کش کیوں پیش کریں آپ نے اُردو کو جو کچھ دیا ہے وہی بہت ہے آپ اُردو کو نظر انداز کر دیں مگر اُردو آپ کو نظر انداز نہیں کر سکتی آپ اپنے منصب کے مقابلے میں اُردو کو قابلِ توجہ نہ سمجھیں مگر اُردو کو ہمیشہ آپ پر ناز رہے گا اور اُردو کو آپ نے اتنی زندگی دے دی ہے کہ اب اُس کی موت

خود آپ کے لئے جستے شیر لانے سے کم نہیں۔ آج اُردو کو آپ سے یہ شکوہ ہو سکتا ہے کہ ؎

تو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

مگر خود ادھر بھی اس بدنصیب کے لئے حالات کچھ زیادہ سازگار نہیں ؎

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالبؔ
تم کو بے مہریٔ یارانِ وطن یاد نہیں

خیر میں پان کھاؤں۔ آپ چائے پیجئے۔ رہ گئی اُردو اس کا اللہ حافظ۔

شوکتؔ تھانوی

راز مرادآبادی کے نام

گڑھی شاہو۔ لاہور

خانِ والا شان!

آپ کو ایک واقعہ سناؤں۔ شاید رشتۂ سخن کی ایک گرہ اس سے کھل جائے۔ سنہ ۱۹۵۱ء کی ایک سہ پہر میں کبھی نہ بھول سکوں گا جب دفتر سے گھر جاتے ہوئے لکھنؤ سے آئے ہوئے ایک بزرگ سرِ راہ مل گئے اور مجھ کو یہ مژدہ سنایا کہ لکھنؤ کے بستئی پان تمہارے لئے لایا ہوں اور کل ہی تمہارے گھر پہ پہنچا چکا ہوں۔ یہ سُنکر مسرت سے زیادہ تعجب ہوا کہ کل سے آج تک گھر والوں نے مجھ کو اس ارمغانِ رنگین کی اطلاع کیوں نہ دی چنانچہ گھر پہنچتے ہی پوچھا تو بھونے ہوئے وہ پان سب کو یاد آئے جو نہایت

بے قدری کے ساتھ باورچی خانے کے ایک طاق پر "گلدستۂ طاقِ نسیاں" کا کام دے رہے تھے۔ ان کی بساط ہی کیا تھی۔ چھوئی موئی۔ دھان پان۔ اس بے قدری کی تاب نہ لاکر مرجھا چکے تھے اور اب مجھ کو مرجھا رہے تھے۔ یہ اس دور کا ذکر ہے جب میری پنجابی سسرال میں پان یا تو کھایا ہی نہ جاتا تھا یا کبھی کبھار کھایا بھی جاتا تھا تو مٹھائی کے طور پر یعنی میٹھا پان۔ وہ ملٹھی اور سونف کا بیہودہ ملغوبہ جسے کھا کر یہ محسوس ہو کہ منہ میں زچہ خانہ ہے۔ ایسے گھر میں ان پانوں کی کیا قدر ہو سکتی تھی۔ مگر آج میری آزردگی دیکھ کر سب کو پہلی مرتبہ پان کی اہمیت کا احساس ہوا۔ مگر یہ احساس اس وقت ہوا جب میں طے کر چکا تھا کہ اس گھر میں رہنا ہے تو پان سے ترکِ وفا کر کے رہنا ہے۔ چنانچہ اسی وقت سے پان چھوڑ دیا اور چھ ماہ تک اس کے ذائقے سے کام و دہن آشنا نہیں ہوا۔ اس عرصے میں طرح طرح سے مجھ کو پان کھلانے کی کوشش کی گئی۔ جب گھر میں پان باورچی خانے کے طاق پر رکھ کر بھولائے جا سکتے تھے اس میں نہایت پر تکلف پاندان بھی آگیا۔ اس کو بڑے ارمانوں سے سجایا بھی گیا مگر میرے لئے یہ سب کچھ بیکار تھا۔ میں پان کھاتا تھا اور اب پان چھوڑ چکا تھا جو پان نہیں کھاتے تھے وہ اب پان کھانے لگے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض اوقات پاندان سے کتراکے گذرنے ہوئے دل بھی کہتا تھا کہ ؎

میں اور بزمِ مئے سے یوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

مگر رفتہ رفتہ میں پان سے بیگانہ ہوتا گیا۔ سُنا تھا کہ پان چھوٹنے سے صحت پر ناگوار اثر پڑتا ہے۔ یہ ہوتا ہے اور وہ ہوتا ہے۔ مگر مجھے کچھ نہ ہُوا اور منہ میں صابن کے جھاگ لئے چھ ماہ تک پھرتا رہا۔ چھٹے مہینے ۱۲ فروری کو میری سالگرہ کے موقع پر بیوی نے مجھ کو ایک چاندی کی ڈبیہ تحفے میں دی۔ کھول کر دیکھا تو اُس میں ویسے ہی پستئی پانوں کی نہایت نفیس گلوریاں بنی سلیقے سے رکھی تھیں۔ میں نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا وہ نہایت انفعال کے ساتھ سر جھکائے کھڑی تھیں ؎

کچھ بات بن پڑی نہ دلِ دادخواہ سے
کیا جانے کیا وہ کہہ گئے نیچی نگاہ سے

یقین کیجئے کہ جس درجہ عزم کے ساتھ چھ ماہ قبل پان ترک کیا تھا اتنے ہی درجہ کی آمادگی کے ساتھ یہ تحفہ قبول کر لیا۔ نہ ترک میں دیر لگی تھی نہ اب اختیار میں جھجک ہوئی۔ اور پھر پان شروع ہو گیا مگر اب فرق یہ تھا کہ اس پان کی قدر شناس وہ بھی ہو چکی تھیں جو اب سے دُور بیٹھا پان کھا کر پان کا خون کیا کرتی تھیں۔ اور صرف پان ہی نہیں بلکہ قوام سے بھی شوق فرمانے لگی تھیں۔

اس واقعے کی یاد تازہ کی ہے آپ کے سفرِ انگلستان نے۔ آپ پان ہی کی وجہ سے اس سفر سے کتراتے رہے کہ بغیر پان کے انگلستان میں کیا کرینگے ؎

باغ میں مجھ کو نہ لے جاؤ ورنہ میرے حال پر
ہر گل تر ایک چشمِ خوں فشاں ہو جائے گا

مگر جب یہ سفر ناگزیر ہو گیا اور آپ کو ہر طرف سے اس سفر کے لئے گھیر ہی لیا گیا تو آپ نے کہا تھا ؎

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی
یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائینگے کیا

چنانچہ پاسپورٹ حاصل کرنے سے پہلے آپ نے یہ بندوبست کیا تھا کہ ہر ہفتے پانوں کا پارسل آپ کو ولایت میں ملتا رہے اور سنا ہے کہ روانگی کے وقت بھی یہ عالم تھا کہ ؎

جب بتقریب سفر یار نے محمل باندھا
تپشِ شوق نے ہر ذرّے پہ اک دل باندھا

دیکھئے کس قدر لطف دے گیا ہے اس شعر میں لفظ "دل" پان اور دل کی شباہت اور ساخت کس قدر ملتی جلتی ہے اور ایک پان کھانے والا ہی جانتا ہے کہ اس کے لئے پان دل سے کتنا زیادہ ضروری ہے۔ بہرحال آپ سدھارے گئے اور آپ کو برابر وہاں بھی پان ملتے رہے۔ چنانچہ جب آپ

برسوں کے بعد واپس آئے تو مشرقی سرخروئی کا نور آپ کے چہرے پر موجود تھا۔ یہ پان ہی تو تھا جس نے لندن میں بھی آپ کو اپنی مشرقیت سے کنارہ نہ کرنے دیا۔ میں جب آپ کا اور اپنا مقابلہ کرتا ہوں تو اس احتجاج پر شرمسار ہو جاتا ہوں جس نے مجھ کو چھ ماہ تک لبِ ساحل تشنہ کام رکھا۔ میں اگر ولایت جاتا تو اپنے اسی تجربے کی بنا پر غالباً پان سے بے نیاز ہو کر جاتا مگر آپ نے سات سمندر پار بھی برسوں اس رشتے کو قائم رکھا۔ چونکہ گم سے شغل فرمانے والے بندگانِ حجاز کے نرغے میں آپ نے اس شغل کی حقیقت پیش کی۔ بیشک آپ نے پان کا حق ادا کر دیا اور جس عزم سے بیڑہ اٹھایا تھا وہ کر دکھایا۔ میں ایک تازہ گلوری سے آپ کا جامِ صحت تجویز کرتا ہوں۔

شوکت تھانوی

پنڈت آنند نرائن ملاّ کے نام

گرڈھی شاہو۔ لاہور

صدیقِ مکرم

سنا ہے کہ جب میں اِدھر آگیا تو آپ نے

بھی پان کھانا شروع کر دیا ہے

خون ہے دل خاک میں احوالِ بتاں پر یعنی
ان کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد

کون سی کوشش تھی جو اُٹھا رکھی گئی ہو کہ آپ بھی پان کھالیں۔ آپ کے بیرنگ لبوں پر آپکے رنگین اشعار سادگی میں پرکاری تو ضرور دکھاتے تھے مگر ہاں ہیں وہ رنگ تو اب آیا ہوگا جب پان کھائے ہوئے مُنہ سے آپ خود

اُن خوش نصیبوں کو سُناتے ہوں گے جن پر آج مجھ کو رشک ہے۔ خبر میں وہاں نہ سہی مگر اس خبر ہی سے خوش ہوں کہ آپ نے پان کھانا شروع کر دیا۔ ع

کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے

آپ سامنے نہ سہی مگر میرا تصور اتنی صناعی تو جانتا ہی ہے کہ میں آپ کو پان کھائے ہوئے دیکھ رہا ہوں ؂

دُور ہی سے دل ہی دل میں ہم تمہیں چاہا کئے
بند کر لی آنکھ اور پھر وں تمہیں دیکھا کئے

سچ بتایئے اس میگساری کی ابتدا کیسے ہوئی۔ یہ کس کی ضد تھی جو پوری کی گئی۔ ہو نہ ہو واقعہ کچھ اسی قسم کا معلوم ہوتا ہے کہ ؂

بچ کے جاؤ گے کہاں ملّا کوئی
ہاتھ میں لے کر گلال آ ہی گیا

ورنہ ایسے بتِ کافر کو رام کرنا کس کے بس میں ہو سکتا ہے۔ آپ کی مشرقیت مسلّم۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ بچپن سے لیکر کالج کی زندگی تک اور وکالت سے لیکر ججی تک آپ نے کبھی اپنی شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ نہیں چھوڑا جہاں تک ہو سکا قمیص بھی نہیں کرتہ ہی پہنا مگر یہ آپ کو اب معلوم ہوا ہو گا مشرقیت بغیر پان کے اپنی تکمیل تک نہیں پہنچتی۔ مگر اب ایک حادثہ یہ بھی سُن لیجئے کہ آپ نے

پان شروع کیا ہے اور میں پان ختم کرنے پر مجبور ہوتا جارہا ہوں اس لئے کہ پان کے سلسلے میں میرا ذوقِ سلیم جو نفاستیں چاہتا ہے وہ ناممکن ہوتی جارہی ہیں۔ پان کی یہاں وہ قسم ملتی ہے جو خدا نہ کرے کہ پان ہو ایک نہایت لدھڑ سا پتہ جس کو ذائقہ کے اعتبار سے برگِ شجرِ تیزاب کہنا مناسب ہوگا اور جس کو چبانا لوہے کے چنے چبانے سے کم نہیں یہاں پان کہلاتا ہے۔ ع

برعکس نہند نامِ زنگی کافور

اس برگِ سبز پر کتھا چونا لگا کر کھانے کے بعد منہ پر اگالدان کا اور منہ کے اندر ریٹیسن کے خاندان کا شبہ ہوتا ہے اور آپ تو جانتے ہیں کہ یہاں پان کے معاملہ میں طبیعت اتنی حساس اور حِس اتنی نازک پائی ہے کہ ؎

خیالِ جام رہا عادتِ شراب کے ساتھ
میں بادہ کش ہوں مگر حسنِ انتخاب کے ساتھ

نتیجہ یہ کہ صرف تیمم پہ گذر اوقات کر رہا ہوں پان نصیب نہیں تو خشک گٹکہ کھا کر دل کو سمجھا لیتا ہوں کہ اس میں پان نہ سہی کم سے کم خلوص تو ہے۔ گٹکہ کھانے کے بعد یہ اطمینان بہرحال رہتا ہے کہ گٹکہ سہی مگر دھوکہ نہیں کھایا۔ مختصر یہ کہ آپ نے اُس وقت پان کھانا شروع کیا جب میں پان چھوڑ چکا ہوں۔ ع

میں ہُوا کافر تو وہ کافر مسلماں ہوگیا

اگر کبھی وہ پان مل جاتا ہے تو اپنے کو عید بقرعید کا نور باف محسوس کرتا ہوں۔

ورنہ آپ تو صرف کھدر پہنتے ہیں میں کھدر رکھتا بھی ہوں۔ کچھ بھی ہو مگر طبیعت
اس کو گوارا نہیں کرتی کہ ؎

اچھی پی لی خراب پی لی　　جیسی پائی شراب پی لی

مگر اس وقت میرے پاندان میں ایک آدھ نازک اندام پان بھی موجود ہے
جن کی ایک گلوری آپ کا نام لیکر کھاتا ہوں غالباً یہ آپکے پان کھانے کا
ثواب مجھ کو پہنچ رہا ہے۔

مجھ کو نہ جانے کیوں اس وقت مشتر کہ ہندوستان کا وہ دَور یاد آرہا ہے
جب ریلوے اسٹیشنوں پر ہندو پانی اور مسلمان پانی ہوا کرتے تھے حالانکہ
ان میں سے کوئی پانی نہ خالص گنگا جل ہوتا تھا نہ خالص آبِ زم زم خیر یہ بھی
اچھا ہوا کہ لاٹھی مارے بغیر یہ پانی جدا ہو گیا۔ مگر میں پانی کے تو نہیں البتہ پان
کے مذہب کا ضرور قائل ہوں۔ پان بیشک ہندو پان اور مسلمان پان ہوتے
ہیں۔ اب تو ماشاء اللہ آپ بھی پان کھانے لگے ہیں یہ تجربہ بھی کر دیکھئے
کہ ایک ہندو پنواڑی کے اور ایک مسلمان تنبولی کے پان کے ذائقہ میں
بڑا فرق ہوتا ہے وہ بیڑا بنائے گا اور یہ گلوری وہ کچھ خوشبوئیں کچھ مٹھاس
کچھ ٹھنڈک۔ کچھ ناریل کا برادہ وغیرہ ڈال کر پان کو بھی بارہ مسالے کی چاٹ
بنا دے گا اور یہ صرف کتھے چونے۔ چھالیہ اور الائچی۔ تمباکو اور قوام کے
توازن کی فکر اس احتیاط سے کریگا کہ گویا شعر کہہ رہا ہے اور خیال ہے

بحر کا کہ کوئی رُکن گھٹنے یا بڑھنے نہ پائے مختصر یہ کہ ؎

ایک کوتاہ نظر ایک ذرا دُور اندیش
فرق کچھ زاہد و مئے نوش کی نیّت میں نہیں

معلوم نہیں آپ نے کون سا پان کھایا۔ بہر حال کھایا تو سہی۔ اب کھانا شروع کیا ہے تو کھانا بھی آجائے گا۔ اس کا سلیقہ بھی آجائے گا اس کے آداب بھی آجائیں گے ؎

اک ذرا کام و دہن کی تربیت درکار ہے
ورنہ یہ مینا میں جو شے ہے بُری ہوتی نہیں

لیجیے خط نہ جانے کیوں شروع کیا تھا اور ذکر چھڑ گیا پان کا۔ اس ذکر کے بعد اور سب کچھ بھول جاتا ہوں یہ نہ جانے کیا سحر ہے پان کا ؎

پھر دیکھیے اندازِ گُل افشانیٔ گفتار
رکھ دے کوئی پیمانہ و صہبا مرے آگے

خیر پھر سہی۔ یار زندہ صحبت باقی۔

شوکت تھانوی

(۲)

گڑھی شاہو - لاہور

زباں تک حرفِ دل لانا بھی مشکل ہوتا جاتا ہے
یہ کیسا یا الٰہی رنگِ محفل ہوتا جاتا ہے

صدیقِ مکرم!

کل کا خط پان سے شروع ہو کر پان ہی پر ختم ہو گیا۔ کہنا کچھ چاہتا تھا حکایت کچھ اور ہی چھڑ گئی - اور جب حکایت لذیذ ہو تو خواہ مخواہ دراز ہو جاتی ہے - آج دانستہ میں پان کا ذکر چھیڑنا نہیں چاہتا ورنہ بات پھر دل کی دل ہی میں رہ جائے گی - کل کی حکایت جس قدر لذیذ تھی آج کا مسئلہ اُسی قدر تلخ ہے - اور جو بحث میں چھیڑنے والا ہوں - جانتا ہوں کہ اُس

سلسلے میں آپ کا دل کس قدر دُکھا ہوا ہے مگر دردِ دل اُسی سے بیان ہو سکتا ہے جو درد کا لذّت شناس ہو اس کے باوجود جو بات آپ سے کہنا چاہتا ہوں اُس پر آپ کی حالت کا اندازہ کرتے ہوئے دل بھر آتا ہے۔ ؎

ہم نے بھی مُلّا کو سمجھانے کو سمجھایا مگر
چوٹ سی لگتی ہے دل پر اس کو سمجھاتے ہوئے

بھارت میں اُردو کو جھپر مار تو نہیں کیا جا سکتا مگر زندہ درگور ضرور کیا جا سکتا ہے۔ یہ صرف اندیشہ نہیں بلکہ واقعہ ہے جس کو آج سے چھ سات سال پہلے خود آپ محسوس کر چکے ہیں۔ ؎

اک موت کا جشن بھی منا لیں تو چلیں
پھر پونچھ کے اشک مسکرا لیں تو چلیں
آ تجھ کو گلے لگا کے مٹتی اُردو
اک آخری گیت اور گا لیں تو چلیں

دل کڑھتا ہے آپ کے ایسے لوگوں کے لئے جن کے لئے وطن کی محبت بھی جزوِ ایمان ہے اور اُردو بھی زندگی کا سرمایہ ہے۔ بھارت کی آزادی جن کی منہ مانگی مراد ہے ان میں سے ایک آپ بھی ہیں مگر اس آزادی کے بعد اُردو کو جو دن دیکھنا پڑے وہ آپ سے بھی کہلوا ہی گئے۔ ؎

لبِ مادر نے ملّا لوریاں جس میں سنائی تھیں
وہ دن آیا ہے اب اس کو بھی غیروں کی زباں سمجھو

اور یہ کیفیت صرف آپ ہی کی نہیں بلکہ میرا ایمان ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو بھی اسی کرب میں مبتلا ہوں گے خواہ ان کے سیاسی مصالح ان کو اس باب میں کتنا ہی محتاط رکھیں وہ اُردو کی حمایت میں کیسی ہی ناپ تول سے کیوں نہ کام لیں مگر اُردو کے لئے ان کا دل بھی مسلسل رہا ہوگا مگر میں نے بھارت میں اُردو کے مسئلہ کو ایک اور ہی زاویہ نظر سے دیکھا ہے ممکن ہے یہ نظر کا دھوکہ ہو اور میں خود اپنے کو فریب دے کر مطمئن ہونے کے بہانے ڈھونڈھ رہا ہوں مگر ۱۹۵۵ء میں دو مرتبہ ہندوستان جانے کے بعد سے میں اُردو کی طرف سے اتنا مایوس نہیں ہوں جتنا صرف اخبارات پڑھ کر ہو جایا کرتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اُردو کو ختم کرنے اور اُردو کی جگہ ہندی کو دینے کی نہایت سمجھی بوجھی جد و جہد جاری ہے مگر اس مشن کو چلانے والوں ہی کا دل جانتا ہوگا کہ یہ مرحلہ کس قدر دشوار ہے اور خود اُن کے حوصلے کس تیزی سے پست ہو رہے ہیں یہاں تک کہ اب اُردو کی مخالفت میں جتنی شدت اختیار کی جا رہی ہے، احساس کمتری اور انفعالِ شکست اُسی شدت سے نمایاں ہو رہا ہے۔

آ گئی ختم پہ بازی دلِ ناکام تری
مات کھانا ہے جسے چل کے وہ چال آئی ہے

یہ دراصل ہندی کے عجز کا اعتراف ہے جو اُردو کی مخالفت کی صورت میں نمایاں ہو رہا ہے۔ اگر ہندی کی مقبولیت اور ہمہ گیری پر ہندی کے ہواخواہوں کو واقعی اعتماد ہوتا تو وہ ہندی کی تبلیغ بیشک کرتے مگر ہندی کی تبلیغ سے زیادہ اُردو کی مخالفت پر اپنا زور ختم نہ کرتے مگر چونکہ ان کو یقین ہے کہ جب تک یہ کمبخت اُردو موجود ہے ہماری ہندی کی دال نہیں گل سکتی لہذا اُردو کی چتا پر ہندی کی بنیاد رکھنے کے منصوبے ہو رہے ہیں مگر عالم یہ ہے کہ یہی ہندی کے ہواخواہ اُردو کے بغیر اپنی نجی اور بے ساختہ زندگی کا ہر کیف کھو چکے ہیں ؎

اب تمنّا بے صلہ ہے اب نگاہیں بے پیام
زندگی ایک فرض ہے جینا چلا جاتا ہوں میں

گو کوئی پوچھے یہ سب کچھ میں آپ کو کیوں لکھ رہا ہوں آپ تو خود ہی اس کرب میں مبتلا ہیں جس میں میں اپنے کو مبتلا پاتا ہوں بلکہ شاید مجھ سے زیادہ قیامت آپ پر گذر رہی ہوگی میں اُردو کے سفینے کی غرقابی کا تماشہ ایک سبکسارِ ساحل کی حیثیت سے دیکھ رہا ہوں مگر آپ تو خود ہی اس سفینے میں موجود ہیں اور اس طوفان سے کھیل رہے ہیں آپ تو ظاہر ہے کہ یہی

کہیں گے کہ ؎

کہیں کیا تم سے ہم اپنے دلِ مجبور کا عالم
سمجھ میں وجہِ غم آتی ہے اور درماں نہیں آتا

مگر یہ سب کچھ آپ کو ایک اندیشے کے ماتحت لکھا جا رہا ہے کہ کہیں یہ حالات آپ کو قانع نہ بنا دیں۔ کہیں اُردو کی جنگ کا سپہ سالار، اُردو کے مزار کا مجاور بن کر نہ بیٹھ رہے کہیں آپ یہ نہ کہنے لگیں کہ ؎

سب کی سنتا جا رہا ہوں اور کچھ کہنا نہیں
وہ زباں ہوں اب جسے دانتوں میں رہنا آ گیا
زندگی سے کیا لڑیں جب کوئی بھی اپنا نہیں
ہو کے شل دھارے کے رُخ پر ہم کو بہنا آ گیا

اگر آپ نے بھی ہمت ہار دی اگر آپ بھی چپ ہو کر بیٹھ رہے اگر آپ کا احتجاج بھی سرد پڑ گیا تو اُردو کا خدا ہی حافظ ہے۔ اُن فرقہ پرستوں کو جو اُردو کو مسلمان سمجھتے ہیں آپ کے سوا کون سمجھا سکتا ہے کہ یہ تو وہ کافر زبان ہے جو سوائے محبت کے اور کسی مذہب کی زبان نہیں مگر یہ واقعہ ہے کہ بھارت میں اُردو پر وہ وقت آ پڑا ہے کہ آپ خود اپنے کو دورا ہے پر محسوس کر رہے ہوں گے ؎

کھڑا ہوں دیر سے گم زیست کے دوراہے پہ
جو کارواں سے چھٹتا ہے وہ مقام آیا

مگر کیا آپ بھی واقعی اس کارواں سے بچھڑ جائیں گے اور اگر بچھڑ گئے تو اردو کا جو حشر ہوگا وہ تو ہوگا ہی مگر خود آپ کیا کریں گے؟

شوکت تھانوی

بابائے اُردو کے نام

گڑھی شاہو۔ لاہور

سیّدی و مولائی

اُردو کا ذکر ہو تو مخاطب آپکے سوا اور
کون ہو سکتا ہے۔ مگر ذرا ٹھہریئے میں ایک تازہ گلوری کھا لوں تاکہ اس
رنگین زبان کے مرثیے میں کچھ خون کی چھینٹیں شامل ہو سکیں۔ آج اتفاق سے
پان بھی وہ میسّر آگئے ہیں جنھیں ایک زمانے میں اہلِ زباں اس لئے
کھاتے تھے کہ گل افشانیٔ گفتار کے انداز دکھا سکیں اور اب بے زبان اس لئے
کھاتے ہیں کہ اپنی زباں بندی پر خون کے گھونٹ پی کر رہ جائیں۔ مگر اس
باب میں صرف بھارت کی شکایت کیوں کی جائے ہمارے پاکستان ہی نے

اُردو کو اُردو کا وہ حق کب دیا ہے جس کی وہ مستحق تھی ؎

ہے ایک تیر جس میں دونوں چھدے پڑے ہیں
وہ دن گئے کہ اپنا دل سے جگر جدا تھا

ہندوستان کی طرف سے تو آپ اطمینان رکھیئے وہاں اُردو ہی کا نام ہندی رکھ دیا جائے تو دوسری بات ہے ورنہ اُردو آسانی سے مٹ نہیں سکتی آپنے اُردو کے لئے جتنا کام کیا ہے اُس سے کسی کافر ہی کو انکار ہوگا مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ ہندوستان میں اُردو کی سب سے بڑی عبدالغنی نشا مگینسک ہے جس نے اپنے گانوں کی شکل میں اُردو کو نہ صرف ہندوستان کے گوشے گوشے تک پہنچا دیا ہے بلکہ لنکا۔ برما۔ آسام اور اس سے بھی آگے انڈونیشیا۔ چین۔ پھر ادھر افریقہ اور نہ جانے کہاں کہاں لتا کے وہ گانے گنگنائے اور گائے جاتے ہیں جو اُردو کے علاوہ اور کسی زبان میں نہیں ہیں۔ ان میں سے بعض ممالک ہیں تو اُردو پہلے ہی سے پہنچی ہوئی تھی لہٰذا ان ممالک کے باشندے بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ ؎

تازہ نہیں ہے نشۂ فکرِ سخن مجھے
تریاکیٔ قدیم ہوں دودِ چراغ کا

مگر وہ ممالک بھی جہاں اُردو مشکل سمجھی جا سکتی ہے ان گانوں کی شکل میں اُردو کا کلمہ پڑھتے نظر آتے ہیں مگر اب یہ دھاندلی ملاحظہ ہو کہ اس اُردو

کو ہندی کہا جا رہا ہے گویا یہ ہندی ہے کہ ؎

راجہ کی بات پر غصّہ جو آگیا

زلفوں کا بادل گالوں پہ چھا گیا

ابھی ابھی دن تھا ابھی ابھی رات ہے

پہلی ملاقات ہے پہلی ملاقات

اور اس اُردو کو بھی ہندی کہا جا سکتا ہے تو کیا تعجب ہے کہ ڈاکٹر عبدالحق کو بھی ڈاکٹر سمپورنانند کہنے پر ان لوگوں کو اصرار ہو۔ حد یہ ہے کہ ابھی پچھلے دنوں جس ہندی تصویر کو پہلا انعام دیا گیا ہے اس کا نام ہے "مرزا غالب" ظاہر ہے کہ مشہور فلم ساز سہراب مودی نے اُردو کے عظیم المرتبت شاعر کو اپنے جس فلم کا موضوع بنایا ہے وہ فلم اُردو ہی کا ہو سکتا ہے مگر اعلان یہی کیا گیا کہ اس سال کا بہترین ہندی فلم "مرزا غالب" قرار پایا ہے۔ صرف اسی ایک واقعہ سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہندوستان میں اردو کو ختم کرنے کی ہر کوشش میں ناکام رہنے کے بعد اُردو زبان کے معاملہ میں مُنہ کی کھانے کے بعد اب یہ ہو رہا ہے کہ ؎ -

موت کو بھی زندگی کہہ کہہ گوارا کیجیے

اور بجائے اُردو کو ختم کرنے کے یہ کیا جائے کہ اسی کو ہندی کہا جائے گویا دشمنی صرف لفظ اُردو سے ہے اور اصل سوال زبان کا نہیں بلکہ رسم الخط

کا ہے اس لئے کہ یہ رسم الخط ہی کمبخت تو بس کی گانٹھ ہے۔ اسی رسم الخط میں تمام مسلم کلچر چھپا ہوا ہے اور اسی رسم الخط کی وجہ سے اُردو کو مسلمانوں کی زبان کہا جاتا ہے اگر یہی زبان ہندی رسم الخط میں آجائے تو اسی کو شری سمپورنانند بھی اپنی مادری زبان کہنے لگیں اور یہی ٹنڈن جی کی بھی منہ مانگی زبان بن جائے۔ رہ گئی آل انڈیا ریڈیو کی خبروں والی زبان اس کے متعلق تو خود ہندی کے ہوا خواہوں کو یہ اعتراف ہے کہ ؎

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

اگر یہی بھارت کی قومی زبان ہوتی تو اسی زبان میں بھارت کے فلم ساز بھی فلم بناتے مگر وہ اپنے سرمائے کو اس خطرے میں نہیں ڈال سکتے وہ جانتے ہیں کہ اگر ان کا فلم اُردو نہ بولے تو سنیما ہال میں اُلّو بولنے لگے متعصب سے متعصب ہندو فلم ساز بھی اس کے لئے مجبور ہے کہ اپنے فلم کو مقبول بنانے کے لئے وہی زبان اختیار کرے جو ایک منظّم سازش کے ماتحت مردود قرار پا رہی ہے مگر لطیفہ یہ ہے کہ ہندی نوازی اور اُردو بیزاری کا جتنا زور ہوا اتنا ہی ہندی کا عجز اور اُردو کی ہمہ گیری نمایاں ہوئی اُردو کو مٹانے کی جتنی کوششیں ہوئیں اُردو کی اتنی ہی ضرورت پیش آئی ؎

ہو کے عاشق وہ پری رُخ اور نازک بن گیا
رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اُڑتا جائے ہے

اور اب سوچنے کرنے کے بعد صرف یہی ایک صورت سمجھ میں آئی ہے کہ
ہندی تو بجائے خود کچھ ہے ہی نہیں یہی ہو سکتا ہے کہ ہندی کو اُردو میں گم
کر کے اُردو کو ہندی رسم الخط میں چھپا لیا جائے۔ ؎

ہاں اہلِ طلب کون سُنے طعنۂ نایافت
دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

بہرحال اُردو زبان کی حیثیت سے تو ہندوستان سے اس وقت
تک ختم نہیں ہو سکتی جب تک کہ ہندوستان گونگا ہونا نہ طے کر لے البتہ اُردو
رسم الخط کا خدا حافظ ہے اور اگر رسم الخط ہندی ہو گیا تو اُردو کے گرامر
میں بڑی آسانیاں پیدا ہو جائیں گی۔ خیر یہ تو "بیرونِ خانہ" کی باتیں ہیں آپ
سے باتیں کرتا ہوں "درونِ در" کی مگر ہاتھ بے ساختہ بڑھ رہا ہے پاندان
کی طرف لہذا قلمدان بند کرتا ہوں تاکہ پاندان کھل سکے اور ایک تازہ گلوری
اُردو کا غم غلط کر سکے۔

شوکت تھانوی

(۲)

گڑھی شاہو۔ لاہور

سیدی و مولائی

کل کا خط کچھ گھر کے باہر ہی باہر ختم ہو گیا اور
اصل موضوع زیر بحث نہ آسکا ہر چند کہ میں جانتا ہوں کہ اس تکلیف دہ ذکر پر
آپ ایک مرتبہ پھر بیتاب ہو کر کہیں گے کہ ؎

غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کئے ہوئے

بلکہ آپ تو کئی مرتبہ یہ طوفان اُٹھا بھی چکے ہیں۔ ابھی جب دستور ساز وں نے
زبان کے سلسلے میں اپنا فیصلہ سُنایا ہے تو آپ نے کھری کھری سُنا کر رکھدی

تھی ۔ الامان والحفیظ کس قدر سخت تھا وہ بیان اور اس بیان سے یہ بھی ظاہر تھا کہ ؎

رگ و پے میں جب اُترے زہرِ غم تب دیکھئے کیا ہو
ابھی تو تلخیِ کامِ و دہن کی آزمائش ہے

مگر سچ پوچھئے تو حق مانگنے کا وقت گذر چکا اور حق تلفیوں نے اب ہم کو اُس منزل پر پہنچا دیا ہے جہاں "کوتاہ دستی" کا دوسرا نام "محرومی" ہے اب تو ہم کو حق خود حاصل کرنا ہوگا اور اس کے لئے نہایت منظم کوششوں کی ضرورت ہے ۔ ہمارا دوسرا بازو اُردو سے اتنا بیزار نہیں جتنا اُردو سے ناآشنا ہے اب یہ کام انجمن ترقی اُردو کا ہے کہ وہ مشرقی پاکستان تک اُردو کو ایسے لباس میں لے جائے کہ اُس سے اجنبیت اور بیگانگی قطعاً نہ رہنے ۔ اسکی ایک ترکیب ذہن میں آئی ہے لقمان کو درسِ حکمت دینے کی جسارت تو نہیں کرتا مگر یہ استدعا ضرور ہے کہ اس تجویز پر غور فرما لیا جائے کیا عجب ہے کہ اسی غور و فکر سے اس اُلجھاؤ کے کسی سُلجھاؤ کی صورت پیدا ہو سکے ۔

جو تجویز میرے ذہن میں آئی ہے وہ یہ ہے کہ کلام پاک کے نہایت ارزاں نسخے لاکھوں کی تعداد میں مشرقی پاکستان پہنچا دیئے جائیں ۔ یہ نسخے مترجم ہوں ۔ ترجمہ اُن ہی کی زبان یعنی بنگالی میں ہو مگر وہ بنگالی لکھی جائے قرآنی رسم الخط میں یعنی اُردو میں ؎

کیا تعجب ہے کہ اس کو دیکھ کر آجائے رحم
واں تلک کوئی کسی حیلے سے پہنچا دے مجھے

پھر یہ حیلہ تو حیلۂ شرعی ہے۔ اس طرح اُردو رسم الخط سے نہ صرف بیگانگی ختم ہو جائے گی بلکہ اس رسم الخط سے اس شناسائی کے بعد اُردو زبان سے بھی وہ قریب آسکیں گے اور ایک مرتبہ اُردو زبان سے قریب آنے کے بعد پھر ان کو یہ سمجھانے کی ضرورت باقی نہ رہے گی کہ جس سنسکرت نژاد بنگالی کو وہ اپنی زبان سمجھ رہے ہیں وہ دراصل ان کی زبان نہیں بلکہ ان کی غلامانہ ذہنیت اور ان کے احساس کمتری کی زبان ہے۔ ان کا مذہب ان کے لئے جو کلچر لایا ہے وہ اپنے کو اس کلچر میں اس وقت تک ڈھال ہی نہیں سکتے جب تک کہ وہ قرآنی رسم الخط کو نہ اپنائیں اور اس رسم الخط میں اپنی زبان سے متصل ترین زبان جو ان کو ملے گی وہ اُردو ہی ہو گی جس سے وہ اپنے اُس کلچر کو بھی سمجھ سکیں گے جو بحیثیت مسلمان کے ان کا ہونا چاہیئے مگر بنگالی زبان کی وجہ سے نہیں ہے۔ وہ کلامِ پاک کی وجہ سے عربی رسم الخط سے ناواقف نہیں ہیں اگر اسی رسم الخط میں ان کو اپنی زبان بھی مل جائے تو وہ اُردو سے قریب نہ آجائیں گے اور اُردو میں لکھی ہوئی بنگالی ہی ان کو اُردو سکھا دے گی۔

ظاہر ہے کہ اس کام کے لئے سرمایہ کی بھی ضرورت ہے اور یہ کام ایک دو

دن کا بھی نہیں۔ مگر اُردو دوستی کا دم بھرنے والے اور مشرقی اور مغربی پاکستان کو شیر و شکر دیکھنے کے آرزومندوں میں ایسے مخیر صاحبانِ حیثیت کی بھی کمی نہ ہو گی جو ایسے مفید مقصد کے لئے اپنے جود و سخا سے کام لے کر آگے بڑھیں۔ اس تجویز کی تفصیل تو آپ کے ذہن میں آئے گی یہ تو ایک اجمال ہے ایک اشارہ ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ میرے ذہن ناقص نے بڑا تیر مارا تو یہ ایک تجویز پیش کی ہے ایسی ایسی خدا جانے کتنی تجاویز خود آپ کے ذہن رسا میں موجود ہوں گی بہرحال یہ تجویز نہ سہی کوئی اور تو کیب سہی مقصد ہے کام سے اور انتھک کام سے اب یہ کام نجی کوششوں ہی سے ہو گا ہمارے قسمت ساز تو اُردو کی تقدیر کا فیصلہ کر ہی چکے ؎

میرے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی
لکھ دیا منجملۂ اسبابِ ویرانی مجھے

اب ان سے کوئی امید رکھنا اپنے کو جھوٹی تسلیوں سے بہلانا ہے۔

حصولِ پاکستان کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد اُردو کی سرسبزی بھی تھا جس کو بھلا دیا گیا۔ اُردو کے سلسلے میں قائد اعظم تک کے کئی وعدے کا احترام قائد اعظم زندہ باد کے نعرے بلند کرنے والوں نے نہ کیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد سے اب تک یہ مسئلہ کھٹائی میں ڈالے رکھا اور آخر اب فیصلہ بھی کیا تو وہ جو قومی زبان کو آدھا تیتر آدھا بٹیر بنا کر رکھ دے۔ بہرحال ان ذمہ داروں

سے اب کچھ کہنا بیکار ہے۔ جو کچھ کہا جا سکتا تھا کہا جا چکا۔ آپ بھی کہتے کہتے تھک سے گئے ہوں گے ؎

رہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی
تو کس اُمید پہ کہیئے کہ آرزو کیا ہے؟

اب تو اُردو کو اپنا جادو خود جگانا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے بنگال کی مناسبت سے جادو جگانا کس قدر برمحل اور بلیساختہ صرف ہُوا ہے۔ اس تقریب میں ایک تازہ گلوری اور سہی مگر آپ کیا جانیں پان اور پاندان کے آداب کو کاش اس میخانے میں کبھی آپ کا گذر بھی ہُوا ہوتا اور وہ نفاست جو آپ کے مزاج میں موجود ہے پان اور پاندان کے حصّے میں بھی آجاتی۔ پان کھانے والوں کی کمی نہیں مگر یہ شغل جو نفاست چاہتا ہے وہ بہت کم نظر آتی ہے۔ مگر آپ سے اس عمر میں یہ توقع ہی بیکار ہے ؎

آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہونگے

شوکت تھانوی

بہزاد لکھنوی کے نام

گڑھی شاہو۔ لاہور

حبیبی!

ابھی مجھ پر ایک شدید حادثہ گذرا ہے۔ جو زلزلہ آیا تھا وہ گذر گیا مگر دماغ اب تک ہچکولے کھا رہا ہے۔ ایک صاحب تشریف لائے تھے میرے پاس۔ میں اس وقت پاندان کی ناز برداری میں مصروف تھا کہ اُن صاحب کو بھی پان کھانے کی ضرورت لاحق ہو گئی۔ کاش وہ مجھ سے فرما دیتے اور میں ان کے لئے گلوری بنا دیتا۔ مگر وہ ٹھہرے بے تکلّف۔ پاندان میرے سامنے سے گھسیٹ لیا۔ پستی پان کو جو شال لحاف کی چادر اوڑھے خوابِ ناز میں تھے جھنجھوڑ ڈالا۔ تلے اُوپر دو تین پان رکھے نہایت

بیدردی سے اُن پر کتھا چونا لیپا۔ کتھے کی چمچی چونے میں اور چونے کی چمچی کتھے میں تھپیڑی۔ علی الحساب فنا کو اس طرح چھڑکا جیسے کوئی جلاد زخم پر نمک پاشی کرے۔ پھر مٹھی چھالیہ ڈالی مختصر یہ کہ اس پان کو آلو چھولے کا دونا بنا کر منہ میں انڈیل دیا۔ پھر ایک انگلی کتھے کی کلھیا میں ڈال کر چاٹ گئے اور میں ایک جھرجھری لے کر رہ گیا۔ پھر وہی انگلی چونے کی کلھیا میں ڈال کر چاٹی گئی اور میں نے چاہا کہ اپنا سر پیٹ لوں۔ اس کے بعد اپنی تھڑی ہوئی انگلیاں کچھ قالین سے صاف کیں۔ کچھ اپنے رومال سے۔ مختصر یہ کہ مجھ کو اس قابل نہ چھوڑا کہ میں اپنے کو صحیح الدماغ سمجھ سکوں۔ وہ نہ جانے کیا کیا فرماتے رہے مگر میرا ذہن بیمار ہو چکا تھا مجھ پر ایک امتلائی کیفیت طاری تھی اور میں صرف یہ چاہتا تھا کہ یہ حضرت جلد سے جلد تشریف لے جائیں چنانچہ وہ خدا خدا کر کے رخصت ہوئے اور میں دونوں ہاتھوں سے دیر تک سر تھامے بیٹھا رہا۔ پھر اُٹھا اور میں نے اپنے مظلوم پاندان کا غسل صحت شروع کیا۔ تمام کتھا بدل دیا۔ چونا پھر سے بھرا۔ صافی تبدیل کر دی۔ پان ایک مرتبہ پھر دھو کر ترتیب سے رکھے۔ مگر اس کے باوجود اب تک پان کھانے کو جی نہیں چاہتا اور رہ رہ کر آپ یاد آ رہے ہیں میں اب تک صرف آپ ہی کو بے احتیاط سمجھتا تھا مگر یہ حضرت تو آپ سے بھی بازی لے گئے خیر ان پر تو کوئی زور نہیں مگر

آپ سے تو میں کہہ ہی سکتا ہوں کہ کیا کوئی ایسی صورت نہیں کہ آپ یہ شغل ترک کر دیں اس میں شک نہیں کہ آپ بذاتِ خود نہایت درویش صفت واقع ہوئے ہیں اور غالباً اپنے ظاہر سے زیادہ اپنے باطن کی صفائی کے قائل ہیں مگر کاش آپ کبھی غور فرماتے کہ آپکے پانوں کی ڈبیا آپ کی چنوٹی اور آپ کا بٹوہ کس حد قابل توجہ محکمۂ حفظانِ صحت ہوتے ہیں پھر آپکے ہاتھوں کی وہ مختلف اُنگلیاں جو بے تکلف چنوٹی میں پیوست ہوتی رہتی ہیں کسی مصرف سے مصروف تمبولی کے لئے بھی آئینہ عبرت بن کر رہ گئی ہیں۔ اس سے پہلے کہ میں آپ سے کچھ اور کہوں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ میں اُن رندوں میں سے نہیں ہوں جو اس کے قائل ہوتے ہیں کہ ؎

یہ اہتمام نہیں کفرِ بادہ نوشی ہے
شراب ہو تو ضرورت نہیں ہے ساغر کی

میں پان کے سلسلے میں اہتمام کا نہایت شدت سے قائل ہوں اور کسی ایسے شخص کو پان کھانے کا مستحق نہیں سمجھتا جو اس ذوق میں ذرا بھی بد ذوقی سے کام لے اور نفاست سے درگذرے۔ اس قسم کے لوگ نہایت شوق سے چاٹ کھا سکتے ہیں کچالو کھا سکتے ہیں مدراسی طریقہ سے دال بھات کھا سکتے ہیں ان کے کھانے کے لئے بے شمار طغوبے

موجود ہیں اگر صرف پان کو بخشدیں تو یہ ایک احسانِ عظیم ہوگا پان کھانے کا حق تو صرف ان ہی کو پہنچتا ہے جو پان کھانے میں وہی نفاست برت سکیں جو عبادات کے لئے مخصوص ہے۔ میں آپ سے عرض کروں کہ میں بازار کے کسی پنواڑی سے پان خرید کر کھانا اور سڑک کے نل سے چلو میں پانی پینا ایک ہی بات سمجھتا ہوں اور اگر شدتِ تشنگی کے باوجود یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ سڑک کا نل کھول کر اس سے چلو لگا دوں اور پیاس بجھاؤں تو یہ بھی برداشت نہیں کر سکتا کہ انتہائی طلب کے باوجود کسی پنواڑی سے پان خرید کر کھاؤں۔ پنواڑی کی دوکان میرے نزدیک پان کی عصمت فروشی کا اڈہ ہوتی ہے اور میں انتہائی کوشش کے باوجود ان شاہدانِ بازاری کی طرف اپنے دل کو مائل نہیں کر سکتا اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ پنواڑی کی دکان میں یوں تو سب کچھ ہوتا ہے پان بھی اور چھالیہ بھی کتھا بھی اور چونا بھی۔ الائچی بھی اور تمباکو بھی بس وہی ایک چیز نہیں ہوتی جس کا نام ہے نفاست۔ وہ اپنے لتھڑے ہوئے ہاتھوں سے کتھے کی کلھیا کی چمچی چونے کی کلھیا میں اور چونے کی کلھیا کی چمچی کتھے کی کلھیا میں ڈال کر پان پر جس بے رحمی اور بے دردی سے لیپا پوتی شروع کرتا ہے اس وقت وہ تنبولی سے زیادہ قصائی نظر آتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ پان بنا نہیں رہا ہے بلکہ پان بگاڑ رہا ہے اور وہ پان پکار پکار کر کہتا ہے کہ ؎

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی

ممکن ہے آپ اس کو میری شدّت پسندی کہیں مگر میرے بھائی پان تو اس سے بھی زیادہ شدّت پسندی چاہتا ہے۔ جس کے مزاج میں احتیاط اور نفاست نہ ہو وہ یہ شوق ہی کیوں کرے ؏

جس کو ہوں دین و دل عزیز اسکی گلی میں جائے کیوں

آپ بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ یہ بھی کوئی زبردستی ہے کہ پان کھاؤ تو اس طرح کھاؤ جس طرح سچی قسم کھائی جاتی ہے ورنہ پان کھانا ہی چھوڑ دو گویا پان کے ساتھ گستاخی کرنے کے لئے بھی کسی لائسنس کی ضرورت ہے۔ مگر آپ کو نہیں معلوم کہ میں پان کھانے کے آداب میں نفاست کو اپنے عقیدے کا درجہ دیتا ہوں اور اس عقیدے کی توہین کو مذہبی قسم کی دل آزاری سمجھتا ہوں بہرحال یہ زبردستی نہیں بلکہ ایک التجا ہے۔ آپ کی عدالت میں اپیل کر رہا ہوں۔ آپ اس کو رحم کی درخواست سمجھیں اور پان کی جانِ ناتواں پر رحم فرمائیں۔ ورنہ یاد رکھیئے کہ صرف آپ کا پان کھانا مذاق سلیم رکھنے والوں پر پان کو حرام کر دیگا۔ پان کے سلسلے میں ایسی بوالہوسی اختیار نہ کیجیے کہ آبروئے شیوۂ اہلِ نظر بھاگتی نظر آئے۔

شوکت تھانوی

ارشد تھانوی کے نام

گڑھی شاہو - لاہور

اخی مکرم

اپنی کتابِ زندگی کے ابتدائی صفحات پر نظر ڈالی
تو ایک عجیب منظر تصویر میں ڈھلتا ہوا سامنے آگیا۔ والد محترم مرحوم و مغفور
کے جب دانت نہ رہے تو ان کے بستر کی بغلی میز پر ایک نہایت خوبصورت
سی پن کُٹی نظر آنے لگی جس میں گلوری ڈال کر وہ کوٹا کرتے تھے پھر وہ کُٹا ہوا
پان چلائے کے ایک چمچے سے نکال کر اپنے مصنوعی دانتوں سے چبایا
کرتے تھے۔ اہتمام یہ ہوتا تھا کہ ان کے لئے خاصدان بھر کر گلوریاں رات
کو تیار کی جاتی تھیں اور ناشپاتی کی نرم صافی میں ان کو لپیٹ کر رکھ دیا جاتا

تھا۔ رات گذرنے کے بعد وہ گلوریاں اس قابل ہوتی تھیں کہ ان کو پن کٹی میں کوٹ کر وہ نوش فرماسکیں اس لئے کہ چھالیہ نرم ہو کر ملائم ہوجاتی تھی۔ وہ اپنی ان باسی گلوریوں کو بڑی احتیاط کے ساتھ رکھتے تھے اور کسی کو کھانے نہ دیتے تھے آنے جانے والوں کے لئے تازہ گلوریاں بن کر آتی تھیں اور ملازمہ گلشن کا یہ کام تھا کہ ایک گلوری جب کوٹی جاچکے تو وہ پن کٹی کو پھر مانجھ کر میز پر رکھدے۔ چمچے کو پھر صاف کرکے پن کٹی کے قریب جگہ دے۔ پن کٹی اور وہ چمچہ تو درکنار ان کو تو اس اگالدان میں پیک تھوکنے میں بھی تامل ہوتا تھا جو صاف نہ ہو۔ ایک طرف یہ احتیاط اور یہ نفاست دوسری طرف یہ قیامت کہ مجھ اناڑی نے ایک دن پان کھاکر جیسے ہی ایک پچکاری رسید کی ہے وہ سامنے تشریف لے آئے۔ ناظم علی طلب کئے گئے گلشن کو آواز دی گئی پانی کے واسطے منگلائے گئے جھاڑو آئی اور پان کی وہ پیک خود اپنی نگرانی میں اسی وقت صاف کرانے کے بعد مجھے اپنے ساتھ لے جاکر بڑے التجائی لب ولہجہ سے فرمایا کہ للّٰہ آپ پان نہ کھایا کیجئے۔ یہ میں اس لئے نہیں کہتا کہ طالب علموں کو پان نہ کھانا چاہیئے۔ یا پان کھانے سے زبان موٹی ہوجاتی ہے یا یہ ایک غیر ضروری لت ہے بلکہ صرف اس لئے پان کی جان بخشی چاہتا ہوں کہ پان کھانے کے بھی کچھ آداب ہیں اور اس طلب کے بھی کچھ تقاضے ہیں اگر آپ ان آداب اور

ان تقاضوں کو سمجھنے سے قاصر ہیں تو ہیں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آپ پان آخر کیوں کھائیں؟ نتیجہ یہ ہوا کہ پھر چوری چھپے یہ شغل جاری رہا مگر والد مرحوم کے انتقال کے بعد دل نے کہا ؎

زندگی ہیں تو وہ محفل سے اُٹھا دیتے تھے
دیکھوں اب مر گئے پر کون اُٹھاتا ہے مجھے

اس شعر کے دوسرے مصرعے کی ضمیر کے اُلٹ پھیر سے ہیں نے عجیب کام لیا ہے۔ خود زندہ ہوں مگر دوسرے مصرعے کو اپنے حسبِ حال بنا لیا ہے۔ پہلے مصرعے کی زندگی کو بھی اپنی نہیں بلکہ ان کی زندگی بنا دیا ہے۔ اس کرتب دکھانے سے مطلب صرف یہ ہے کہ اب کھلّم کھلّا پان کھانا شروع کر دیا۔ بھرے ہوئے خاصدان سامنے رہنے لگے مگر یہ غالباً اُسی تعلیم کا اثر تھا جو صحن میں پان کی پچکاری رسید کرنے کے موقع پہ دی گئی تھی کہ خود بخود نفاست برتنے کا رآنے لگی۔ پان کھانے کے آداب کی سختی سے پابندی ہونے لگی۔ پان کھانے۔ پان کھلانے اور پان بنانے ہیں کیا مجال کہ نفاست کا معیار کبھی پست ہوا ہو ؎

ہوئی اس دَور ہیں منسوب مجھ سے بادہ آشامی
پھر آیا وہ زمانہ جو جہان ہیں جامِ جم نکلے

یہ اُسی زمانے کا ذکر ہے کہ بھوپال ہیں ایک دن آپ کے ساتھ کچہری

جانے کا اتفاق ہوا جہاں ہائیکورٹ میں بحیثیت وکیل کے آپ کو بحث کرنا تھی
وہاں آپکے موکل نے آپ کو دیکھتے ہی اپنی ہتھیلی پر بھوپالی گٹکا انڈیلا تمباکو
کے زرد زرد پتے اُس پر چھڑکے پھر آئینہ لگی ہوئی ایک ڈبیا سے چونا
انگلی سے نکال کر اس گٹکے پر ٹپکایا اور اپنے دوسرے ہاتھ سے اس گٹکے
کو اس طرح مسلا جیسے کوئی کفِ افسوس مل رہا ہو۔ نتیجہ یہ کہ گٹکے کے
خشک کہتے ہیں یہ تر چونا بالکل مل گیا تو اس موکل نے یہ دستکاری کا نمونہ آپ
کی خدمت میں پیش کیا اور آپ نے اُس سے وہ نامعقول گٹکا لے کر ایک
پھنکا ایسا مارا ہے کہ میں ایک جھرجھری لے کر رہ گیا اور وہ پان بھی مجھ کو
تھوک دینا پڑا جو میرے منہ میں تھا۔ اس کے بعد آپ بحث کرتے رہے اور
میں اسی واقعہ پر غور کرتا رہا کہ آپکے موکل کے ہاتھ کس قدر صاف تھے
اور صاف ہاتھوں سے بھی ان رگڑوں کے بعد کتنا میل نکل سکتا ہے۔ اس
کے بعد میں نے آپ کو خود اسی طرح اپنے ہی ہاتھوں سے گٹکے میں چونا
مسلتے ہوئے کئی مرتبہ دیکھا اور کچہری میں یہ بھی دیکھا کہ آپ اُسی نگرہ با ہنوں
والے موکل کو بادہ طلب انداز سے دیکھتے رہتے تھے ؎

اک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کئے ہوئے

ہر چند کہ بھوپال کے گٹکے میں بھی ایک بات تھی اور اگرچہ بجیب الطرفین

پان وہاں نصیب نہ ہو تو اس گنگلے سے ایک حد تک یہ غم غلط کیا جا سکتا تھا مگر جب میں نے اس کو بانٹنے کی یہ ترکیب دیکھی تو اس کو بھی دُور ہی سے سات سلام کئے اور جب کبھی کسی محفل میں یہ گنگلا سامنے آیا دل نے یہی کہا کہ ؎

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

آپ کے پاس اب بھی بٹوہ رہتا ہے۔ بڑے میں گنگلا ہوتا ہے چھوٹا بھی ہوتی ہے۔ تو کیا آپ اب تک ذوقِ سلیم کا کلیجہ اسی طرح مسلتے رہتے ہیں۔ اور کیا اب تک آپ نے اس شغل کو ترک کرنے کے متعلق کبھی سنجیدگی سے غور نہیں کیا آپ کی زندگی کے دوسرے شعبوں میں نفاست اور احتیاط کی کمی نہیں یہی تو حیرت ہے کہ پان تمباکو سے آپ کو آخر کیا شکایت ہے جو یہ مستقل انتقام آپ لے رہے ہیں۔ اگر وہ شکایت معلوم ہو جائے تو میں پان کی طرف سے اظہارِ معذرت کے لئے حاضر ہوں۔

شوکت تھانوی

محمود نظامی کے نام

گڑھی شاہو - لاہور

صدیقی !

مجھ پر الزام یہ ہے کہ میں نے آپ کو تمباکو کا
عادی کر دیا ہے مگر شاید خود آپ سے زیادہ اور کوئی نہ جانتا ہو کہ ؎
عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا
اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام
اور آپ ان ہی بے نام زمانوں سے تمباکو نوشی کرتے آئے ہیں اور آپ
کہہ سکتے ہیں کہ ؎
تازہ نہیں ہے نشۂ فکرِ سخن مجھے
تریاکیٔ قدیم ہوں دودِ چراغ کا

میں نے یہ جرم ضرور کیا ہے کہ آپ کی تمباکو نوشی میں ایک سلیقہ، ایک نظم اور ایک معیار قائم کیا ہے۔ پہلے آپ اس کے قائل تھے کہ ؎

اچھی پی لی خراب پی لی
جیسی پائی شراب پی لی

مگر اب آپ اس کے قائل ہیں کہ "جیسی پائی" کی شرط نہیں بلکہ پئیں گے تو اچھی ہی پئیں گے۔ حد یہ ہے کہ آپ کی تمباکو نوشی خلوص کے اُس مقام پر نظر آتی ہے جہاں پان کے بارے بھی آپ متحمل نہیں۔ در اصل یہ تحمّل رخصت ہُوا تھا اُس دن جب ہماری قسمت میں وہ نام نہاد پان رہ گیا تھا جو اور خواہ کچھ بھی ہو مگر پان تو وہ ہرگز نہیں ہے اور نہ خدا کرے کہ پان ہو۔ ایسی دبیز اور کثیف چیز پان تو ہو ہی نہیں سکتی۔ اُس کو برگِ شجرِ پٹ سن کہیے یا اُس پودے کے پتّے جس میں لوہے کے چنے پیدا ہوتے ہیں۔ بہرحال پان کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ یوں کھانے کو کیلے کے پتّے پر کتھا چونا لگا کر جس کا جی چاہے کھالے نہ چالان ہوگا نہ یہ کوئی قابلِ دست اندازی پولیس جرم ہے۔ بہرحال شکر ہے کہ آپ نے پان کا دھوکہ کھانے کو پان کھانا نہ سمجھا اور چھالیہ - الائچی۔ خالص تمباکو، خشک کتھا اور شفّاف چونا کھا کر اپنے ذوق کی تسکین کا سامان بہم پہنچایا مگر ان اجزائے ترکیبی میں بھی نوازن کے شدّت سے پابند رہے اور نفاست سے کبھی خالی الذہن

نہ رہے۔ میں نے آپ کو اس جرمہ نوشی کا مستحق اسی دن سمجھ لیا تھا جب آپ اس مرکب کی ایک خوراک کھانے کے بعد اِدھر اُدھر دیکھ کر اور ہر طرف سے مایوس ہو کر غسلخانے کی طرف دوڑے تھے اور پہلی پیک وہاں تھوکی تھی۔ وہ بھی اُس طشت میں جو نل کی ایک ہی دھار سے صاف ہو جائے۔

صاحب ہمارے ملک میں تھوکنا ایک بہت بڑا مسئلہ ہے اگر اس کو ملک گیر مسئلہ کہا جائے تو غلط نہ ہو گا جی چاہتا ہے کہ اس قسم کے تمام اشعار میں کچھ ایسی تعریفیں کر دی جائیں کہ ؎

"تھوک دیتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے
ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے"

اس مسئلہ کی ہمہ گیری کا اسی سے اندازہ کر لیجئے کہ ریل کے ڈبوں سے لیکر پلیٹ فارموں تک پر اور سینما گھروں سے لے کر چڑیا گھر تک ہر جگہ صرف یہ تختیاں نظر آئیں گی کہ "مت تھوکو" حالانکہ اور بھی امتناعی تختیاں لگ سکتی ہیں مثلاً "چوری نہ کرو" یا "مت لڑو" یا "جیب نہ کاٹو" یا "شادی نہ کرو" یا "دوستوں سے ڈرو" وغیرہ مگر سب سے زیادہ زور اسی نہ تھوکنے پر اس لئے دیا گیا ہے کہ خدا جانے ہم پر یہ کیا مار ہے کہ ہم علاوہ اگالدان کے اور ہر جگہ تھوکتے پھرتے ہیں اور اکثر عین ان تختیوں کے نیچے ہی اپنا یہ شوق اس طرح پورا کر لیتے ہیں کہ گویا یہ تختیاں ہمارے ایک پیدائشی حق

کو غصب کر رہی ہیں۔ آزادی ملنے کے بعد جب یہ اندازہ ہوا کہ واقعی ایک آزاد قوم کو اس طرح اُس کے کسی حق سے باز رکھنے کی کوشش حق بجانب نہیں ہے تو اب دوسری ہی صورت اختیار کی گئی ہے کہ بعض عمارتوں میں ریت اور بُرادے سے بھرے ہوئے بکس جا بجا لگے ہوئے ہیں اور ان پر لکھا ہے "یہاں تھوکو"۔ چنانچہ بعض امن پسند بلا ضرورت بھی ان بکسوں میں یہ چندہ ڈالتے رہتے ہیں اور بعض بال کی کھال نکالنے والے اب بھی اس سلسلے میں یہ سوچتے ہیں کہ "مت تھوکو" اگر ایک قسم کا حکم امتناعی تھا تو "یہاں تھوکو" ایک قسم کی زبردستی ہے اور کسی کو اس کا کوئی حق نہیں کہ ہم کو ہماری کسی ذاتی ضرورت کے لئے مجبور کرے۔ اگر ہم نے "یہاں تھوکو" کی پابندی سر جھکا کر کر لی تو اس قسم کی تختیاں بھی نظر آنے لگیں گی کہ "یہاں ناچو" یا "یہاں قلابازی کھاؤ" یا "یہاں مار کھاؤ"۔ عہدِ حاضر کے ایک بہت بڑے محقق کی دریافت یہ ہے کہ "یہاں تھوکو" نہ کوئی حکم ہے نہ کوئی زبردستی بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں تھوکنا آپ کا قومی۔ اخلاقی معاشرتی اور تمدنی فرض ہے اور اس کا ایک پہلو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ؎

ہے تھوکنے کی چیز یہاں بار بار تھوک

اور ان صاحب نے غالباً رفعِ شر کے لئے ایک مطلب یہ بھی نکالا ہے کہ "یہاں تھوکو" کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ بغیر تھوکے تم رہ ہی نہیں سکتے لہٰذا بہتر ہے کہ تم کو

تھوکنے کی ایک جگہ بتادی جائے تاکہ تم کسی میز پر یا قلمدان میں یا ٹیلیفون میں یا لیٹر بکس وغیرہ میں نہ تھوک دو۔

کیوں صاحب دُنیا کے کسی مُلک میں بھی اپنے باشندوں کے ساتھ یہ تحقیر آمیز مذاق ہؤا ہوگا کہ ان کو تھوکنے تک کی جگہ بتائی جائے مگر اس مذاق کی ضرورت اس لئے پیش آئی ہوگی کہ آج بھی یہ دیت اور بُرادے کے بکس صاف شفاف ٹنگے رہتے ہیں اور درو دیوار پر پیک کی گلکاریاں اور تھوک کی نقاشیاں نظر آتی ہیں آپ ہی بتائیے کہ ایسے مُلک میں پان کا کیا مستقبل ہو سکتا ہے اور پان کو یہ بدنام کرنے والے اس ذوق کے کیونکہ مستحق سمجھے جا سکتے ہیں۔ آپ کو دوڑنا پڑتا ہے غسلخانے کی طرف لہٰذا آپ اس کے مستحق نہیں مستحق تو وہ سمجھے جاتے ہیں جن کا قول یہ ہوگا۔

نقصاں نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب

شوکت تھانوی

مجید لاہوری کے نام

گڑھی شاہو۔ لاہور

صدیقِ مکرّم

لائل پور سے واپسی کے بعد سے کئی مرتبہ ارادہ کر چکا ہوں کہ آپ کو مخاطب کروں مگر اب تک روئے سخن آپ کی طرف نہ ہو سکا اور روسیاہی مول لیتا رہا۔ نہ آپ کی صحت سے مرعوب ہو سکا نہ اپنی ناتوانی پر غور کرنے کا خیال آیا۔ شکر ہے کہ آج رمضان شریف نے مجھ کو بھی اس شرافت پر آمادہ کیا ہے اور سحری جگانے والوں نے اس وقت بیدار کر دیا ہے جب گھر کے تمام ہنگامے سوئے ہوئے ہیں۔ موقع غنیمت ہے آئیے آپ سے دو باتیں ہو جائیں۔ مگر ٹھہریئے میں ایک تازہ گلوری کھاؤں

آپ بھی اپنی مُٹھی میں دبی ہوئی پڑیا کھول کر اپنی قسمت کا لکھا پان کھا لیجئے جو
میری اصطلاح میں پان سے زیادہ چورن ہوتا ہے ورنہ پڑیا میں کیوں بندھتا
بہرحال پان کھانے کے بعد کیا چبا چبا کر باتیں ہوں گی میر صاحب اسی موقع
کے لئے کہہ گئے ہیں ؎

آیا جو اپنے گھر سے وہ شوخ پان کھا کر
کی بات اُن نے کوئی سو کیا چبا چبا کر

آپ نے کسی ایسے شریر بچّے کو کبھی دیکھا ہے جس کی کسی شرارت پر کان
پکڑ لیجئے تو وہ بسورتا ہوا تھوڑی دُور تک چلا جاتا ہے اور اس کے بعد
کان کھینچنے والے کو مُنہ چڑھا کر بھاگتا ہے اور دل میں خوش ہوتا ہے کہ
تھوڑا بہت انتقام تو لے ہی لیا۔ اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا
ہماری اور آپ کی یہ تمام شگفتہ نگاری جو مزاح لطیف اور طنز و تفنن وغیرہ
کہلاتی ہے ستم ہائے روزگار سے دُور بھاگ کر مُنہ چڑانے کے علاوہ کچھ اور
بھی ہو سکتی ہے۔ زندگی کے تلخ حقایق سے ہمارا یہ فرار ہم کو خواہ مزاح نگار
کہلوائے یا طنز شعار مگر واقعہ تو یہی ہے کہ ؎

وے ہم ہیں جن کو کہئے آزار دیدہ مردم
اُلفت گزیدہ مردم کلفت کشیدہ مردم

ہمارا ہی دل جانتا ہے کہ ہم اپنے کتنے آنسوؤں کا گلا گھونٹ کر اپنے

لبوں پر وہ ایک تبسم پیدا کرتے ہیں جو دوسروں کے لئے ہنسنے کی تحریک کا کام دیتا ہے۔ ہم اپنے آنسو پی کر دُنیا کو ہنساتے ہیں۔ ہم اپنی افسردہ دلی سے انجمن کو افسردہ نہیں کرتے بلکہ اپنے اشکوں سے دُنیا کے لئے مسرّت نچوڑتے ہیں۔ اپنے کو چکنا گھڑا ثابت کرتے ہیں۔ آلام پروف ثابت کرتے ہیں۔ خود مضحک قسم کے سوانگ رچا کر اپنے اُوپر دُنیا کو ہنساتے ہیں اور کسی سے یہ مطالبہ بھی نہیں کرتے کہ ؎

اب تو ہماری طرف سے اتنا دل کو تھم رکھو
سختیٔ ایّام کی اب تک سبھی سہتے رہے ہیں ہر ہم

مختصر یہ کہ یہ جھوٹ جو ہم مزاح کے نام سے بولتے ہیں ان حالات میں جو ہم پر گذر رہے ہیں آخر کہاں تک سر سبز رہے گا کیا بقول مولانا اسمٰعیل میرٹھی یہ کاغذ کی ناؤ ہمیشہ چلتی رہے گی۔ ہنسنے ہنسانے کی اس اداکاری کی رسّی آخر کہاں تک دراز ہو گی۔ آپ تو خیر ماشاءاللہ درزشی قسم کے مزاح نگار ہیں مگر مجھ کو اپنی جانِ ناتواں کی طرف سے شدید اندیشہ ہے اور اس باب میں بارہا اپنا اور آپ کا تقابل کر چکا ہوں ؎

اے عشق کیا جو مجھ سا ہُوا ناتواں ہلاک
کر ہاتھ تک ملا کے کوئی پہلواں ہلاک

ان حالات کا مقابلہ کرنے اور ان حالات کی ہنسی اُڑانے کے لئے ہانفی

کا کلیجہ اور شیر کا دل چاہیئے جو سچی بات یہ ہے کہ اپنے پاس نہ ہے نہیں البتہ
ایک آپ ایسے ہیں کہ خود ہاتھی کے پاس آپ کا کلیجہ ہو تو کوئی تعجب نہیں۔
معاف کیجیئے گا میں شروع شروع میں آپ کے متعلق غور کیا کرتا تھا کہ اس قسم کا
"ابوالہول" انسان مزاح نگار یا کسی قسم کا آرٹسٹ کیسے ہو سکتا ہے وہ عناصر
جن سے ایک پوری عمارت بن سکتی تھی آپ کی تخلیق پر صرف کر دیئے گئے تو
اس کا مطلب یہ کہاں سے ہو گیا کہ آپ بجائے رستم زماں ہونے کے شاعر اور
انشا پرواز بننے کی زبردستی بھی کر سکتے ہیں مگر رفتہ رفتہ یہ نکتہ بھی سمجھ میں آگیا کہ
اور کچھ نہ سہی مگر مزاح نگاری کرنے کے لئے تو کم سے کم اتنا ہی ڈبل ڈول ہونا
چاہیئے کہ زمانے کی تلخیوں کے احساس کو اتنے بڑے جسم سے گذر کر دل تک پہنچنے
کے لئے بھی ایک مدت درکار ہو ع

آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک

پھر یہ کہ اس احساس سے اگر آپ نے واقعی گھلنا بھی شروع کیا تو آخر کہاں تک
گھلیں گے۔ وہی مثل کہ "ہاتھی لاکھ لٹے پھر بھی سوا لاکھ کا" زمانے کی تلخیاں آپ
پہاڑ سے ٹکرا کر اپنا ہی سر پھوڑ سکتی ہیں پہاڑ کے زیاں کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔
کاش مزاح نگاری شروع کرنے سے پہلے ہم نے بھی دوراندیشی سے کام لیا
ہوتا اپنی صحت اور غذا کا اتنا ہی خیال رکھا ہوتا جتنا آپ نے رکھا ہے کہ یہ عمر
ہونے کو آئی مگر "گلیکسو" کا استعمال جاری ہے۔ مدعا یہ کہ آپ تو بے تنگ

زور آزمائی کرتے رہیں گے اور جب اللہ نے زور دیا ہے تو کیوں نہ زور آزمائی کریں اور اگر کبھی غمِ زمانہ دل تک پہنچ بھی گیا تو آپ زیادہ سے زیادہ یہی کہیں گے کہ ؎

کثرتِ غم سے دم لگا رُکنے　　　حضرتِ دل میں آج دنگل ہے

مگر یہاں تو اپنی فکر ہے کہ یہ ڈھونگ کب تک رچائیں گے دُنیا کو کہاں تک ہنسائیں گے جبکہ روز بروز یہ حالت ہوتا جاتا ہے کہ ؎

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی　　　اب کسی بات پر نہیں آتی

کچھ دن تک تو ہمارے رونے پر بھی دُنیا ہنسے گی۔ اس گریہ وزاری کو بھی مزاحیہ اداکاری سمجھا جائے گا مگر آخر کب تک؟ اس تبسّم سے زندگی کی تلخیاں کب تک نہ جھانکیں گی۔ آپ تو خیر غم پر پہاڑ بن کر خود گر سکتے ہیں مگر ہم اپنے ہنستے ہوئے نحیف و زار پیکر پر غم کے پہاڑ کب تک سنبھالے رہیں گے۔ اگر کوئی مشورہ ذہن میں آجائے تو دیدیجئے گا فی الحال تو بڑا یا کھول کر چورن کھائیے جس کو آپ پان کہتے ہیں۔ میں بھی اپنا مُنہ کا پان اگالدان کے سپرد کرکے پاندان کی طرف ہاتھ بڑھا رہا ہوں ۔

شوکت تھانوی

پنڈت جواہر لال نہرو کے نام

گڑھی شاہو۔ لاہور

مکرمی!

انسان اپنی ایک زندگی کے اندر کتنی ہی مختلف زندگیاں بسر کرتا ہے۔

مثلاً آپ اپنی ہی زندگی کو دیکھ لیجیئے۔ ایک آپ کی ذاتی اور نجی زندگی ہے
دوسری آپ کی وزارتِ عظمیٰ کی زندگی ہے۔ اپنی ذاتی اور گھریلو زندگی میں
آپ اُردو کے دلدادہ ہیں خواہ آپ سوتے ہوئے انگریزی زبان میں بڑبڑاتے
ہوں مگر عالمِ بیداری میں اُردو ہی کو اپنی زبان سمجھنے اور سمجھاتے رہتے ہیں
مگر جہاں وزیرِ اعظم کی حیثیت سے بولے یہی زبان سماعت پر ایسے پتھر برسانا

شروع کر دیتی ہے کہ پھول برسانے والے کی طرف سے بہ پتھر اؤ حیران کر دیتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آپ کی بیساختگی کو جب انتظاماً ہندی بولنا پڑتی ہے تو آپ کا ایسا جادو بیان مقرر بھی ہکلانے لگتا ہے۔ زبان لڑکھڑاتی ہے۔ دماغ اُردو میں سوچتا ہے اور زبان اس کو ہندی میں پیش کرتی ہے اٹک اٹک کر ایک عجیب تکلف بلکہ تکلیف کے ساتھ اور بعض اوقات خود اپنے ساتھ اس زبردستی سے آپ خود بھی عاجز آ کر اُردو کی حمایت کر جاتے ہیں وزیرِ اعظم کی حیثیت سے بھی اُردو کے خونِ ناحق کی فریاد آپ کی زبان پر آجاتی ہے مگر ایک عجیب بیکسی اور بے بسی کے ساتھ۔ وزیرِ اعظم اور بے بسی۔ پردھان منتری اور اس قدر مجبور ع

مجبور اس قدر ہوں کہ با اختیار ہوں

مجھے معلوم ہے کہ اُردو کے لئے واقعی آپ کا دل کڑھتا ہے مجھے یہ بھی اندازہ ہے کہ آپ دل سے اُردو ہی کو ہندوستان کی قومی زبان سمجھتے ہیں مگر سیاسی مصلحت یہی ہے کہ اُردو کو علاقائی زبان تسلیم کرانے میں بھی اپنے اثر اور اقتدار سے کام نہیں لے سکتے اس لئے کہ یہ سودا آپ کی ہردلعزیزی کے لئے بہت مہنگا ثابت ہو سکتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اُردو سے عشق کے باوجود اُردو سے بے وفائی پر آپ مجبور رہیں سے

ہم اپنی آنکھوں کب تک رنگِ عشق دیکھیں   آنے لگا ہے لہو رخسار پر توبہ کر

آپ اپنی تقریروں میں اُردو کی حمایت کر جاتے ہیں۔ اُردو کی تائید میں بیانات بھی دے دیتے ہیں مگر لاکھوں دستخطوں کے ساتھ اُردو کو علاقائی زبان تسلیم کرانے کا جو مطالبہ راشٹرپتی بھون کی طاقِ نسیان پہ نہ جانے کب سے پڑا ہے اُس کو نہ اپنی کابینہ میں زیرِ بحث لا سکتے ہیں نہ بابو راجندر پرشاد کو اس کی طرف متوجہ کر سکتے ہیں

"آپ کے ان تائیدی بیانوں سے سوکھے دھانوں پانی پڑ جاتا ہے۔ دل کو بڑی تقویت حاصل ہوتی ہے کہ پنڈت نہرو ایسی عظیم شخصیت اُردو کی حمایت کر رہی ہے مگر اس قسم کے بے شمار بیانات کے بعد بھی اُردو کو علاقائی زبان بنانے والا وہ لاکھوں دستخطوں کے ساتھ جو مطالبہ کیا گیا ہے بدستور کھٹائی میں پڑا ہوا ہے

شاید آپ سے زیادہ اس حقیقت سے کوئی باخبر نہ ہوگا کہ بھارت میں اُردو کو مٹانے کی جتنی کوششیں ہو رہی ہیں اُردو اسی شد و مد سے اُبھر رہی ہے اُردو کو جتنا جتنا پامال کیا جا رہا ہے اُردو اسی قدر پیر جماتی جا رہی ہے

اُردو کو ہندوستان کی زبان تسلیم نہیں کیا جاتا مگر سر چڑھ کر جو جادو بول رہا ہے وہ
اُردو ہی کا ہے اور ایک عام عالم یہ ہے کہ ع
تکلم بنی ہے مری بے زبانی
کچھ دن ہوئے مشرقی پنجاب میں ہندی اور پنجابی کی جو کشمکش شروع ہوئی تھی
اس کے متعلق آپ نے خوب کہا تھا کہ جھگڑا ہے ہندی اور پنجابی کا اور لڑائی
لڑی جا رہی ہے اُردو زبان میں۔ ان تمام باتوں کو جانتے ہوئے۔ اُردو
کے لئے اپنے دل میں ایک جگہ رکھتے ہوئے اور اُردو ہی کو اپنے ضمیر کی زبان
سمجھتے بھی آپ کی یہ مصلحت جس میں آپ مبتلا ہیں سیاست ہو تو ہو
سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیفیت آپ اپنے اُوپر کب تک طاری
رکھیں گے کہ ؎

اقرار نہیں لیکن اقرار کی صورت ہے
انکار کی صورت ہے انکار نہیں کرتے

شوکت تھانوی

صوفی غلام مصطفےٰ تبسّم کے نام

گڑھی شاہو۔ لاہور

صدیقِ مکرم

اتفاق دیکھئے کہ میرے پاس چار پانچ تمباکو آگئے۔ زعفرانی پتّی دلّی کے ایک دوست لے آئے اور اس کو میرے گھر آنے کا پاسپورٹ سمجھا۔ مشکی دانہ ایک اور عزیز کو لانے کی توفیق خدا نے دے دی۔ مرادآباد کا تمباکو آپ جانتے ہیں کس قدر قاتل ہوتا ہے۔ ہر چند کہ نہ اس میں خوشبو کا تکلف ہوتا ہے نہ حسن و جمال میں زعفرانی پتّی یا مشکی دانہ کا حریف مگر اس کی سادگی میں بلا کی پرکاری ہوتی ہے اور تمباکو کا جو خلوص اس میں ہوتا ہے وہ کسی اور تمباکو میں ممکن نہیں مگر مصیبت یہ ہے کہ اس کے استعمال

ہیں ذرا اعتدال سے آگے بڑھے اور شامت آئی مگر اہلِ ظرف جانتے ہیں
کہ وہ اس تند خو کے کس حد تک متحمل ہو سکتے ہیں۔ بہر حال یہ تمباکو بھی آ گیا
ہے اور ایک دوست نے آگرے میں ایک عجیب و غریب تمباکو دریافت
کیا ہے جس کو میں اس مراد آبادی تمباکو اور زعفرانی پتّی کے مابین سمجھوتے
کا درجہ دیتا ہوں۔ بہر حال یہ تمام تمباکو اس وقت میرے سامنے ہیں اور میں
لذنیہ کی عشرت اندوزیوں کا جشن اس طرح منا رہا ہوں کہ ان سب کو
علیحدہ علیحدہ چکھ چکنے کے بعد اب ان کا کاک ٹیل بنا رہا ہوں۔ میں آپ سے
عرض نہیں کر سکتا کہ زعفرانی پتّی مشکی دانے میں مل کر کس قدر ہوش ربا ہو جاتی
ہے اور اگر اس کی تیزی بڑھانے کے لئے ایک چٹکی مراد آبادی فتنۂ عالم
کی ڈال دی جائے تو اس مرکّب کی تاب صرف بادہ گسارانِ کہن مشق ہی
لا سکتے ہیں۔ یہ مرکّب میں ہر ایک کو تو نہیں دے سکتا ؎

دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

کاش آپ ہوتے اور میں اس کاک ٹیل کا سرور آپ کی آنکھوں میں دیکھ کر
آپ سے داد حاصل کرتا۔ مگر اس مرکّب کے لئے ضرورت ہے اسی بیستی بان کی
جس پہ یہ مرکّب وہی لطف دیتا جو گوری گوری ہتھیلی پہ رطلِ گراں دے سکتا ہے

؎ بادۂ ناب عجب چیز ہے ساقی لیکن
اور ہی کچھ ترے ہاتھوں سے مزا دیتا ہے

خیر وہ پان تو یہاں کہاں؟ البتہ بڑی جستجو کے بعد ایک گوارا قسم کا پان مل گیا ہے نفاست اور لطافت میں تو خیر اس کا بھی کوئی تعلق اس لطیف اور نازک پان سے نہیں ہے مگر ذائقہ ایسا ضرور ہے کہ اسے کھانے کے بعد تسکین نہ سہی مگر غصہ بھی نہیں آتا بہر حال اب تو اسی سے غم غلط کریں گے۔ یہ مرکب اسی پان کے ساتھ کھائیں گے ع

اسی برگِ خزاں دیدہ پہ اک تصویر دیکھیں گے

کاش آج اس کے بجائے اصل پان مل جاتا۔ اور اس دودھیا گلوری میں یہی معطر مرکب خود بھی کھاتے اور کسی اور کو بھی کھلا کر آنکھوں میں سرخ ڈورے دیکھتے اور لبوں پر شفق پھوٹی ہوئی نظر آتی تو جرأتِ رندانہ سے کام لیکر یہ بھی کہہ سکتے کہ ؎

صدقے ترے ہونٹوں کے رنگینی و رعنائی
اک موجِ تبسم میں کل رازِ گلستاں ہے

اس پان کی یاد نے آج کئی مرتبہ میرے ساتھ یہ سلوک کیا کہ جو پان میسر ہے اس کی گلوری کئی مرتبہ اٹھائی اور اٹھا کر پھر خاصدان میں رکھدی ؎

کھینچکر اک آہ کس نے رکھدیا جامِ شراب
دیدنی آج اضطرابِ ساقیٔ میخانہ ہے

مگر یہ بھی کفرانِ نعمت ہے کہ غنیمت قسم کا پان میسر ہے تمباکو کا ایسا کاک تیل

تیار ہے اور اُس پان کی یاد میں جو اب خواب و خیال ہے اس کیف کو بھی بے کیفیوں کے نذر کیا جا رہا ہے۔ لہٰذا میں یہ پان کھاتا ہوں اور اس کے تعطر میں آپ کی یاد کو بسانے کی کوشش کرتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ یہاں کے پان کھانے والوں میں آپ کا دم غنیمت ہے بڑے سلیقے اور نفاست سے آپ بھی پان کھاتے ہیں بلکہ اپنے اس ذوق کے بڑے دُلار آپ ہی کرتے ہیں میں نے آپ کی وہ ناز برداریاں دیکھی ہیں جو قوام بنانے میں آپ فرماتے ہیں اور آپ کی آنکھوں میں وہ چمک بھی دیکھی ہے جو اپنے قوام کی داد حاصل کرنے کے وقت پیدا ہوتی ہے آپ اپنے اس ذوق میں بھی پورا شاعرانہ سلیقہ صرف کرتے ہیں۔ یوں تو خیر حقّے کے سلسلے میں بھی آپ نفاست پسندی کی حد کر دیتے ہیں مگر وہ میرا موضوع نہیں ہے البتہ پان کے سلسلے میں آپ کے اہتمام دیکھ دیکھ کر جی خوش ہوتا ہے اور دل چاہتا ہے کہ یہ مذاقِ سلیم آپ کے ایسے چند خوش مذاق افراد تک محدود نہ رہے اور یہ کہنے کی نوبت نہ آئے کہ ؎

کہاں سے لائے گا ساقی کوئی یہ ذوقِ سلیم
ہمارے بعد درِ میکدہ نہ باز رہے

آج میں آپ سے کہتا ہوں کہ میں آپ کا کلام اگر کہیں چھپا ہوا پڑھتا ہوں اُس وقت بھی آپ کو اپنے ذہن میں کھینچ لاتا ہوں تاکہ آپ کے کلام میں وہ رنگ بھی دیکھ سکوں جو آپ کے لبوں پہ ہوتا ہے اور آپ کے قوام کی وہ مہک بھی محسوس کر لوں

جو آپ کو سامنے بٹھا کر آپ کا کلام خود آپ سے سنکر محسوس ہوتی ہے. کبھی کبھی یہ تصور اس قدر جامع ہو جاتا ہے کہ واقعی دماغ پھولوں سے بس جاتا ہے. اور آپ کے لبوں کی رنگینی میرے ماحول کو رنگین بنا دیتی ہے.

مگر آپ کے قوام سے ایک شکایت ہے کہ کبھی کبھی اُس میں عطر کی زیادتی اس حد تک ہو جاتی ہے کہ پان چبانتے ہیں اور شُبہ یہ ہوتا ہے کہ خس کی ٹٹی چبا رہے ہیں صرف یہی نہیں بلکہ قوام میں عطر کی روغنیت تک آ جاتی ہے. ممکن ہے یہ شکایت اُس دَور کی ہو جب قوام کے تجربات کا سلسلہ جاری تھا. بہرحال یہ بات گرہ میں باندھ لیجئے کہ خوشبو قوام کی روح سہی مگر اتنی بھی نہ ہو کہ روح فرسا بن جائے.

شوکت تھانوی

مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام

گڑھی شاہو۔ لاہور

سیّدی و مولائی

کئی مرتبہ ارادہ کیا کہ آپ سے پوچھوں تو سہی
کہ آخر آپ پان کیوں نہیں کھاتے۔ اور بغیر پان کھائے آپ کی تحریروں میں یہ
رنگینی کہاں سے آجاتی ہے۔ میں نے خشک سے خشک موضوعات پر آپ کی
تحریریں دیکھی ہیں مگر رنگینی ان میں بھی اپنا رنگ چوکھا رکھتی ہے اور اس کے
بعد اور بھی جی چاہنے لگتا ہے کہ کاش آپ پان کھاتے ہوتے۔ میری سمجھ میں
یہ بات نہیں آتی کہ پان نہ کھانے والے اپنی زندگی میں ایک خلا کیوں نہیں
محسوس کرتے۔ خیر آپ نے تو زندگی کا ایک ایسا اسلوب وضع کر لیا ہے

کہ اس باب میں بھی آپ کی طرف سے اسی جواب کا اندیشہ ہے کہ ؎

بجھتی ہی نہیں اب کسی ساغر سے مری پیاس
شاید مرا مقصد ہی مری تشنہ لبی ہے

مگر میں آپ کو بتاؤں کہ میرے تخیل میں عیش زندگی کا سب سے بہتر تصور کیا ہو سکتا ہے۔ شفاف چاندنی کے فرش پر جگمگاتا ہوا پاندان ہو جس میں ہر چیز نہایت نفاست اور سلیقہ سے رکھی ہو۔ شالباف کی نم صافی میں لکھنؤ کے بینئی پان ہوں۔ کیوڑے میں بسا ہوا دودھیا کتھا ہو۔ براق چونا ہو۔ باریک تراشی ہوئی چھالیہ ہو جس کو باجرہ کہتے ہیں۔ بھری ہوئی موٹی موٹی الائچیاں ہوں۔ قسم قسم تمباکو ہوں جن میں سے کوئی دوسرے دبے کا نہ ہو۔ قوام ہو۔ سنہری روپہلی گولیاں ہوں اور احباب بھی وہ ہوں جن میں سے ہر ایک پان سے رندانہ ذوق رکھتا ہو اور اس ذوق نیز نفاست کا اتنا ہی قائل ہو جتنا میں خود ہوں۔ اگر یہ سب کچھ میسر ہو تو یہی زندگی کا حاصل ہے اور یہی میرے لئے جنت ہے۔ جنت کے متعلق بہت کچھ سن رکھا ہے بہت کچھ پڑھا ہے مگر پان کا کہیں تو کہہ نہیں۔ اعمال تو خیر ایسے ہیں نہیں کہ اپنا جنت جانا طے سمجھوں مگر خیال یہی آتا ہے کہ فرض کیجئے جنت نصیب ہو بھی گئے اور وہاں پان نہ ملا تو کیا ہوگا ؎

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست
لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

ایک چھوٹی موٹی جنت کا ذکر یہاں بے محل نہ ہوگا کہ جب لاہور میں میری شادی ہوئی اور اپنی پنجابی سسرال میں جا کے میں نے پاندان کو غائب پایا تو جی چاہا کہ خوش دامن صاحبہ سے کہہ دوں کہ ؎

یہی ٹھہری جو شرطِ وصلِ لیلیٰ
تو استعفیٰ مرا با حسرت و یاس

میری خاطر مدارات چائے سے ہوئی طرح طرح کی مٹھائیوں سے ہوئی۔ سگریٹ دکھلائے گئے مگر پان کی بات ہی جب کسی نے نہ پوچھی تو مجبوراً خود ہی کہنا پڑا کہ اگر آسانی سے مل سکے تو پان منگائیے مگر جب اس کے جواب میں ایک سسرالی عزیز نے فرمایا کہ "میٹھا یا الائچی سپاری کا؟" تو ؏

بس خون ٹپک پڑا نگہِ انتظار سے

آخر میرے لئے بازار سے وہ نامعقول پان منگائے گئے جن کو کھانا گالی کھانے سے کسی طرح کم نہ تھا۔ اور آپ باور فرمائیے کہ مجھ کو بڑی سنجیدگی سے اس بات پر غور کرنا پڑا کہ یہ زندگی بھر کے ساتھ کا معاملہ ہے۔ یہاں زندگی نام ہے پان کا اور وہاں پان کا کوئی تعلق ضروریاتِ زندگی سے نہیں ان حالات میں کیسے نبھے گی۔ آخر طے یہی کیا یہاں بھی پان کی تحریک چلائی اور کامیاب بنائی جا سکتی ہے ؏۔

میکدہ ساز ہوں میں میکدہ بر دوش نہیں

چنانچہ اب بھی گھر ہے اور بھی اس کے گھر والے کون ہے جو پان نہیں کھاتا اور کون ہے جس کو مناسب قسم کے تمباکو کی جستجو نہیں رہتی وہ شریک حیات جو پہلے عہد بعہد بھی پان کھانے کی قائل نہ تھیں اب آپ کی دعا سے نہ صرف پان کھاتی ہیں بلکہ مراد آبادی پتی تک نہایت بے تکلفی سے نوش فرماتی ہیں۔ قوام ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر منگاتی ہیں اور کوئی لکھنؤ کے پان سوغات کے طور پر لے آئے تو پھولی نہیں سماتیں ؎

اب تو تاثیر غم عشق یہاں تک پہنچی
کہ اِدھر ہوش اگر ہے تو اُدھر ہوش نہیں

پان کھانا بڑی بات نہیں البتہ پان کا اہتمام کرنا ایک بات ضرور ہے چنانچہ وہ نہایت نفیس چھالیہ خود کاٹتی ہیں۔ نہایت سڈول گلوریاں خود بناتی ہیں کتھے چونے کے توازن کا جو سلیقہ ہونا چاہیئے وہ ان میں پیدا ہو چکا ہے اور "میٹھے پان" کا نام سنکر اب ان کو بھی ہنسی آتی ہے مختصر یہ کہ ؎

لائے اس بُت کو التجا کر کے
کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے

ان کے بعض عزیزوں نے ان کو سمجھایا۔ پان اور تمباکو کے خلاف ایک منظّم مہم سر کرنے کی کوشش کی گئی۔ طبی اعتبار سے تمباکو کے مضر اثرات ان کے ذہن نشین کرنے کی کوشش ہوئی مگر تو بہ کیجئے ؎

ہم کہیں آتے ہیں واعظ تیرے بہکانے میں

اسی میخانے کی مٹی اسی میخانے میں

یہاں تک لکھنے کے بعد ہوش آیا کہ لکھنا خدا جانے کیا تھا اور خط ختم ہونے کو آیا صرف پان کے ذکر پر۔ خیر اس صحبت میں نہ سہی اگلی صحبت میں سہی۔ یار زندہ صحبت باقی۔ جو چند ضروری باتیں ہیں ان کو کل پر اُٹھائے رکھتا ہوں اس وقت تو ہاتھ بے ساختہ خاصدان کی طرف بڑھ رہا ہے جس میں چند سطر گلوریاں شالباف میں دُلہن کی طرح لپٹی ہوئی موجود ہیں ایک گلوری کھا کر آپ کے لئے بھی دعا کرونگا کہ خدا آپ کو بھی یہ توفیق عطا فرمائیے۔

شوکت تھانوی

(۲)

گڑھی شاہو۔ لاہور

سیدی و مولائی

کل کا خط یہاں سے شروع ہو کر یہاں ہی پر ختم ہو گیا اور جو خاص باتیں عرض کرنا تھیں وہ خاصدان کی نذر ہو کر رہ گئیں۔ مجھے کچھ آپ کی سچی باتوں کے متعلق عرض کرنا ہے جو آپ کے "صدق" میں چھپنے کے بعد پاکستان کے متعدد اخبارات میں نہایت پابندی کے ساتھ چھپتی رہتی ہیں اور میں نہایت پابندی کے ساتھ ان کو پڑھتا رہتا ہوں سمجھ میں نہیں آتا کہ داد آپ کی بیباکی اور جرأت تحریر کی دی جائے یا بھارت کی حکومت کی اس فراخ دلی کی جس نے اس جرأت تحریر کو اب تک

لائق تعزیر نہیں سمجھا۔ اگر آپ اس کو دربار کے سلسلے کا کوئی استعارہ نہ
سمجھیں تو یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ دربار میں وہ کون گر مجھ سے بیر ہر رنگ کا کام
نہیں۔ مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ آپ بیر رکھتے ہیں۔ آپ تو یہ چاہتے ہیں
کہ آپ کی حکومت صدق کے آئینے میں خود اپنی کوتاہیوں کا عکس دیکھنے سے
اور سچ تو یہ ہے کہ آپ لگی لپٹی رکھتے ہی کب ہیں۔ وہ ہندوستان ہو یا
پاکستان بخشتے ہی کسے ہیں ؎

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں

پاکستان کے متعلق آپ نے کب رعایت سے کام لیا ہے کوئی ایسی ویسی
خبر آپ کی نظر سے گذری اور آپ نے پاکستان کو آڑے ہاتھوں لیا طعن
اور طنز کے زہر میں بجھے ہوئے نشتروں سے تواضع کر دی۔ اسی طرح بھارت
میں مسلمانوں کے ساتھ جو بھی زیادتیاں ہو رہی ہیں ان کو خواہ اور کوئی پی جائے
خاموشی کے ساتھ سہہ جائے مگر آپ نہیں ملتے۔ حال ہی میں بھوپال کے
فسادات کے متعلق آپ کا ایک شذرہ نظر سے گذرا۔ حیرت ہوتی ہے اس تبصرہ
اظہار پر:۔

"بھوپال ایک مسلم ریاست تھی صدیوں اس پر مسلمان نواب اور
بیگمات حکمران رہیں [illegible] کہ ہم سب سے "مستبدانہ" اور "جابرانہ"
دور میں بھی کوئی مثال [illegible] پر نشانہ اور فساد کی ملتی ہے؟"

اس نرالی عہد میں کبھی رعایا کا یوں خون بہا ہے؟ دکانیں لٹی ہیں؟ عورتوں کی بے حرمتی ہوئی ہے؟ یوں بار بار پولیس کو گولیاں اور لاٹھیاں چلانے کی ضرورت پیش آئی ہے؟ اس دور میں بھی کسی ہندو مندر کی بے حرمتی ہوئی ہے؟

یہ جرأتِ اظہار ایمان کی پختگی کا ایک پرتو ہے ؎

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

حکومتِ وقت ہو یا سوسائٹی - اپنے عزیز ہوں یا دوست جس کی جو بات بھی آپکے نزدیک غلط ہوئی آپ نے اسی طرح اپنے اختلاف کی شدت دکھائی ہے۔ مجھ کو معلوم ہے کہ آپ مجھ کو کس قدر عزیز رکھتے ہیں - اسی صدق کے کالموں میں مجھ کو آسمان پر چڑھایا جا چکا تھا کہ آپ کو یہ خبر پہنچی کہ میں نے ایک فلم میں کام کیا ہے۔ بس پھر کیا تھا تمام وابستگی دھری رہ گئی - محبت - خصوصیت - مروّت سب سے آنکھیں پھیر لیں اور کیا کوئی دشمن دشمنی کرے گا جو اس دوست نے دوستی کا حق ادا کیا۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ بھی محبت کی فراوانی ہے کہ میرے متعلق یہ خبر سُنکر ایک دھچکہ سا لگا ہے اور آپ اُبل پڑے ہیں مگر اللہ بچائے اس محبت سے ؎

کچھ کہہ تو گیا برقِ غضب نے جسے پھونکا
اُف کر نہ سکا جس کو ترے پیار نے مارا

سعادت حسن منٹو کی موت پہ آپ نے جو کچھ لکھا اس پہ کافی لے دے ہوئی کسی نے کہا کہ یہ گڑے مُردے اُکھاڑنا ہے۔ کسی نے کہا موت تمام اختلافات کے دروازے بند کر دیتی ہے اور اس باب کو پھر کھولنا سنگدلی کی انتہا ہے کسی نے کہا ایک سچے رند پر مرنے کے بعد جھوٹے تقدس کا رعب جمایا جا رہا ہے غرض جتنے منہ اتنی باتیں اور اکثریت آپ کے خلاف تھی یہ سنجیدہ سے سنجیدہ افراد نے بھی یہ ضرور کہا کہ مرنے کے بعد تو یہی کہا جاتا ہے کہ ع

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

اور مولانا یہ کہہ رہے ہیں کہ خدا ہرگز نہ بخشے مرنے والے میں سوائے عیب کے کچھ تھا ہی نہیں۔ منٹو کی زندگی میں یہ اختلاف ہوتا تو ٹھیک تھا اب اس کے مرنے کے بعد یہ زیادتی ہے مولانا کی۔ مگر میں نے اس وقت بھی کہا تھا اور اب بھی کہتا ہوں کہ کاش یہی منٹو آپ کا سب سے قریبی عزیز ہوتا اس وقت لوگ اندازہ کرتے کہ آپ اپنے اس عزیز کو بھی نہ بخشتے اور یہی چاہتے کہ خدا بھی نہ بخشے۔ میں نے اپنے بعض دوستوں کو سمجھایا کہ مولانا کا قول یہ ہے کہ مرنے والا مر جاتا ہے مگر اس کی اچھائیوں کی طرح اس کی برائیاں بھی زندہ رہتی ہیں اور یہ مخالفت دراصل منٹو کی نہیں بلکہ ان افراد کی ہے جو مرحوم کی اس قسم کی کمزوریوں کو نہایت فخر سے نشہ زدہ رہاں سمجھ کر ملش کر رہے ہیں مگر میں دیکھ رہا تھا کہ اس باب میں اکثریت آپ کے خلاف تھی مگر اس قسم کے موقعوں

پھر آپ کا عالم تو یہ ہوتا ہے کہ۔ ع

خلقے پس دیوانہ و دیوانہ بکارے

بہرحال بات کہیں سے کہیں جا پہنچی۔ عرض صرف یہ کرنا تھا کہ اب جبکہ خود آپ اپنے وطن میں اجنبی کی سی زندگی بسر کر رہے ہیں اور بتیس دانتوں میں زبان کی سی حالت ہے آپ کی ان بیباک تحریروں کو حکومت کب تک نظر انداز کرے گی۔ ایسا نہ ہو کہ پانی سر سے اونچا ہو جائے۔ "صدق" اور اس کی سچی باتوں سے ہم کو محروم ہونا پڑے اگر قلم میں ذرا سی لچک پیدا کر لی جائے اور "آ بیل مجھے مار" کی پالیسی اختیار نہ کی جائے تو بھی کام چل سکتا ہے یہ مشورہ لقمان کو درسِ حکمت دینے سے کم نہیں مگر خود آپ ہی بتایئے آپ نے اپنا کیا انجام سوچ رکھا ہے؟

شوکت تھانوی

صباح الدین عمر کے نام

گڑھی شاہو۔ لاہور

جیلبی!

میں نے اس وقت اپنی بزمِ تصور آراستہ کی تو آنکھ اُٹھاتے ہی نظر آپ پر پڑی۔ آپ پان کی "تیوڑی" اپنے بائیں گال میں نکالے گم سُم بیٹھے نظر آئے۔ جی چاہا کہ آپ کو بجائے "جیلبی" کے "جلیبی غریبی" کے القاب سے مخاطب کر دوں مگر چونکہ خلوت کی باتیں کھلے خطوط میں نہیں ہوتیں لہذا یہ ارادہ ملتوی کر دیا۔ اس بزمِ تصور میں بھی آپ کی یہ بے زبانی اس قدر پریشان کر رہی ہے کہ کفرانِ نعمت سہی مگر پان تک کو برا بھلا کہنے کو جی چاہتا ہے اور یہ واقعہ ہے کہ آپ کا پان کھا کر کسی

محفل میں بیٹھنا اہلِ محفل کو غیر متکلم فلم کے دور میں پہنچا دیتا ہے۔ بات یہ ہے کہ آپ تو پان کو دال روٹی سمجھ کر چار پانچ گلوریاں یکمشت منہ میں ٹھوس لیتے ہیں اور پھر پودینے کی چٹنی کی طرح قوام چاٹ کر لبوں پر مہر سکوت لگا لیتے ہیں اور باقی حضرات کو آپ کے جیتے جی آپ سے صبر کر لینا پڑتا ہے اس لئے کہ آپ کا عالم تو یہ ہوتا ہے کہ ؎

منہ تکا ہی کرے ہے جس تس کا

حیرتی آئینہ ہے یہ کس کا

چشمے کے موٹے موٹے شیشوں کے نیچے گول گول دیدے زبان کی قائم مقامی کرنا چاہتے ہیں۔ ع۔

نگاہیں گفتگو کرتی ہیں تم خاموش رہتے ہو

مگر جو شخص دل کی بات زبان سے کہہ کر نہ سمجھا سکے وہ نگاہوں سے خاک گفتگو کر سکتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ آپ کا یہ پان کھانے کے بعد "گرہم مشکل وگرنہ گوہم مشکل" والا عالم احباب کے لئے ایک قہر خداوندی ہوتا ہے اور بڑا دل گردہ ہے ان کا جو آپ کو اس عالم میں برداشت کر لیتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ پان کھانے والے بڑے بڑے دیکھے مگر پاندان کھانے والے صرف آپ ہی نظر آئے۔ جس وقت خاصدان کی طرف آپ کا ہاتھ بڑھتا ہے جی چاہتا ہے کہ آپ سے عرض کیا جائے کہ اس شغل سے پہلے اگر پسماندگان

کے لئے کوئی وصیت وغیرہ کرنا ہو تو کر لیجئے ورنہ پھر آپ کہاں اور ہم کہاں۔

۶۔ خاک ایسی زندگی پہ تم کہیں اور ہم کہیں

مگر آپ عموماً پان کھا کر مہر بلب رہنے کے لئے تاش کھیلنا شروع کر دیتے ہیں تاکہ بولنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے اور اگر کوئی سخن گسترانہ بات آ پڑی اس عالم میں بھی تو آپ کی کیفیت دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ حلق سے "قوں قوں قوں" کریں گے دیدے مٹکائیں گے۔ ہاتھ کے اشاروں سے بات کریں گے اور آخر کار اپنا مفہوم سمجھانے کی ہر کوشش میں ناکام رہ کر صبر کر لیں گے مگر یہ ناممکن ہے کہ جو خزانہ منہ میں بھرا ہوتا ہے وہ اگالدان میں جھونک دیں یہ دولت اس طرح لٹا دیں۔ اس عالم میں آپ کے ہاتھوں کے اشارے میر کا یہ شعر ہمیشہ یاد دلاتے ہیں ؎

کس کس طرح سے ہاتھ نچاتا ہے وعظ میں
دیکھا جو شیخ شہر عجب دستگاہ ہے

معلوم نہیں آپ کو پان کھانے کا مشورہ کس نے دیا تھا۔ تاریخ اس باب میں خود بھی آپ ہی کی طرح پان کھائے خاموش نظر آتی ہے البتہ یہ صرف اتنا چلا ہے کہ قوام کھانا آپ نے رفیع احمد خاں مرحوم سے سیکھا تھا اور کوئی تعجب نہیں کہ آپ نے پہلے قوام کھانا سیکھا ہو اور بعد میں پان کھانا ؎

کتابِ عشق کی ترتیب خود ہی مبہم ہے
فنا کا ذکر بقا سے یہاں مقدم ہے

بہر حال آپ کا پان کھانا اور آدم غوری ملتی جلتی سی چیزیں معلوم ہوتی ہیں خیر ہماری بلا سے وہ کچھ بھی ہو اندیشہ تو صرف یہ ہے کہ اگر آپ ہی کی قسم کے چند اور پان کھا کر پان کو بدنام کرنے والے پیدا ہو گئے تو پان کھانے کے لئے بھی لائسنس لینا پڑے گا اور پان کھانے کی بھی وہی سزا مقرر ہو جائیگی جو اقدامِ خودکشی کی ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ آپسے اعتدال کی اُمید تو فضول ہے البتہ یہ اپیل ضرور کی جا سکتی ہے کہ کیا آپ پان اور پان کھانے والوں پہ یہ تاریخی احسان فرما سکتے ہیں کہ پان کھانا ہی چھوڑ دیں اگر آپ روٹی کی طرح پان کھانے کے بجائے پان کھانے کی طرح روٹی کھا لیا کریں تو اس سے آپ کی صحت میں بھی اضافہ ہوگا یہ روٹی جسم کو بھی لگے گی ہڈیوں کے ڈھانچے میں بوٹی بھی نظر آنے لگے گی اور سب سے بڑی بات یہ کہ پان کھا کر احباب کی محفل میں آپ کی یہ کیفیت نہ رہے گی کہ ؎

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں
واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں

قصہ مختصر یہ کہ اگر اس پان کھانے میں آپ کی کوئی خاص مصلحت نہ ہو تو للہ پان ترک کر دیجئے آپکے کھانے کے لئے اور ہزاروں چیزیں ہیں مثلاً

گنڈیریاں۔ رس گلّے۔ وہی بڑے پان سے آخر کونسی خطا ہوگئی ہے کہ آپ کو یہ شوق اس شدت سے ہوگیا ہے۔ البتہ اگر منہ میں علی الحساب پان ٹھونس کر مہر بلب ہوجانے کا مقصد یہ ہے کہ ایک چپ ہزار بلائیں ٹالتی ہے تو دوسری بات ہے اور اگر آپ اس طرح یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ ؎

خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغِ مردہ ہوں میں بے زباں گورِ غریباں کا

تو صاف صاف کہیئے۔ دیکھیئے پان کھانے کی وجہ سے جو چپ آپ سادھ لیتے ہیں اُس کے لئے اس شعر میں لفظ "خون گشتہ" کیسا رنگ دے رہا ہے ممکن ہے آپ یہ سب کچھ اس لئے کر رہے ہوں کہ یہ کہہ سکیں کہ ؎

اگرچہ عمر کے دس دن یہ لب رہے خاموش
سخن رہے گا سدا میری بے زبانی کا

مگر کاش آپ کو معلوم ہوتا کہ آپ سے زیادہ بے زبان وہ پان ہوتا ہے جس کا آپ خونِ ناحق کرتے ہیں۔

شوکت تھانوی

لتا منگیشکر کے نام

گڑھی شاہو۔ لاہور

عالمہ محترمہ،

آپ کے نام یہ خط اس ذیل میں ہرگز نہیں آتا کہ ع

تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیئے

اس لیئے کہ جس حد تک ملاقات ضروری ہے وہ ہوتی ہی رہتی ہے ؎

تو نہیں تو کیا ہوا گو تشنگی کمی رہی

ہم ترے بغیر بھی تجھ سے ہم کلام ہیں

آپ کی نواؤں سے جو دُنیا آج گونجی ہوئی ہے اُسی دُنیا کے بسنے والوں میں سے ایک میں بھی ہوں۔ آپ کی یہ دُنیا صرف بھارت یا پاکستان تک

محدود نہیں بلکہ آپ کے نغموں کی گونج میں فرا افغانستان سیلون - ایران - برما - انڈونیشیا بھی بستے ہیں۔ انگلستان اور امریکہ کی نشرگاہیں بھی آپ کی آواز فضا میں منتشر کرتی ہیں اور یہ آفتِ ہوش دایمان آواز تو دور دراز گھر گھر پہنچی ہوئی ہے۔ کون سا خطہ ہے جہاں یہ شراب نہ برستی ہو۔ ان نغموں کی زبان کوئی سمجھے یا نہ سمجھے مگر یہ گیت گنگنانے والے وہاں بھی مل جاتے ہیں جہاں اُردو ابھی تک نہیں پہنچی ہے۔ میں نے اُردو کے سب سے بڑے مبلغ مولانا عبدالحق کے نام جو خط لکھا ہے اس میں نہایت سنجیدگی کے ساتھ عرض کیا ہے کہ بھارت کی سب سے بڑی مولانا عبدالحق لتا منگیشکر ہے جس کے گانے اس ہندوستان کے گوشے گوشے میں رچے ہوئے ہیں جو اُردو سے اپنا دامن بچانے کا دعویٰ دار ہے مگر اُردو ہے کہ لتا کے گانوں کی شکل میں اپنے گن گوا رہی ہے اور خدا جانے ان گانوں کے بجلیس میں کن کن ممالک میں پہنچ چکی ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ اُردو کی جتنی تبلیغ غیرارادی طور پر آپ نے کی ہے اُردو کے کسی مبلغ یا اُردو کے کسی تبلیغی ادارے سے ممکن نہ ہو سکی ہندوستان میں تو خیر گلگلوں سے پرہیز کرنے والے بھی یہ گڑ کھاتے ہی رہتے ہیں مگر ہندوستان اور پاکستان سے باہر بھی اُردو نہ سمجھنے والے بھی یہ گنگناتے ہوئے پائے گئے ہیں کہ

شمع پہ آکر گرتے ہیں کیوں جل جل کر یہ پروانے
مر کر جینا جی کر مرنا پگلے تو کیا جانے

بلما جا جا جا

آپ کی آواز کی ایک ہی موج بڑے بڑے فرشتہ صورت بزرگوں کو
کچے دھاگے بیں باندھ کر ریڈیو سٹ کے قریب لے آتی ہے خواہ وہ اپنے
زہد و تقدس کے اعتبارات سے کتنے ہی دُور کیوں نہ ہو جائیں وہ کشاں کشاں
آتے ہیں اور عمر رفتہ کو آواز دیتے ہوئے آتے ہیں ؎

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

آواز کا یہ جادو اور موسیقی کا یہ تاثر ہی تو ہے کہ ہندوستان سے اُردو کو فنا کیا جارہا ہے
مگر لتا کے گانوں میں جو اُردو سمائی ہوئی ہے وہ سر آنکھوں پہ قبول ہے۔ اُردو
کے لیئے بھارت کے دل کو جتنا تنگ کیا جا رہا ہے آپ کی آواز اتنا ہی کشود
پیدا کرتی جاتی ہے حالانکہ یہ بھی درست ہے کہ ؎

کھل تو جاتا ہے مغنّی کے بم و زیر سے دل
نہ رہا زندہ و پائندہ تو کیا دل کی کشود

مگر جب تک آپ کے نغموں کی گونج باقی ہے کم سے کم اُس وقت تک اُردو آپ کے
ملک میں زندہ رہے گی۔ یوں تو آپ کے پردھان منتری بھی اُردو کا دم بھرتے رہتے
ہیں اور ان کے ملک میں اُردو کا جو خون ناحق ہو رہا ہے اُس سے اپنا دامن
بچانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں مگر یہ خون ان کے دامن پہ نہ سہی ان کی
حکومت کے دامن پہ بہر حال نظر آرہا ہے۔

لہو بہنے کا مقتل کی زمیں پر
نہ دامن پر نہ اُن کی آستیں پہ

بات دراصل یہ ہے کہ آپ کے گیتوں کی شکل میں جو اُردو ہندوستان میں اب تک قابلِ قبول بنی ہوئی ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ دُنیا کی تمام قوموں کی قدیمی روایتوں سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ گانے سے جانور تک متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے پھر یہ تو اُردو کے لاکھ دشمن سہی مگر انسان تو ہیں ہی۔ کرشن جی کی بانسری کی لے پر اگر گئو ماتا چرنا چھوڑ دیتی تھیں تو لتا کے گانوں کی دشمن ہیں اس امتیاز کا ہوش کس کو ہو سکتا ہے کہ اس آواز کے پردے میں اُردو ہے جو روح میں سمائی چلی جاتی ہے۔ اگر یہی ہوش آجائے تو وہ چیخ اُٹھیں کہ سے

اگر نوا میں ہے پوشیدہ موت کا پیغام
حرام میری نگاہوں میں نائے و چنگ و رباب

بہرصورت اُردو کی جو نشر و اشاعت آپ کی حسین آواز کے ساتھ ہوئی ہے اس نے اُردو کو ہندوستان میں امر بنا دیا ہے کوشش کی گئی تھی اُردو کے باب میں ایک ہندوستان گیر سناٹا پیدا کرنے کی مگر آپ کے نغموں نے اُردو کی ایسی گونج پیدا کی ہے کہ اس نقارخانہ اُردو میں ہندی کے طوطی کی آواز بمشکل سنی جا سکتی ہے۔ مانگی جا رہی تھی اُردو کے لئے علاقائی حیثیت

مگر آپ کے گانوں نے اس کو ملک گیر حیثیت خود بخود دیدی۔

مکتوب یہیں تک پہنچا تھا کہ ریڈیو سے آپ کا نغمہ اُبھر کر فضا پر چھا گیا۔ لہذا اب میں بھی ایک تازہ پان کھا کر آپ سے باتیں کرنے کے بجائے آپ کی باتیں سُننا چاہتا ہوں معلوم نہیں آپ پان کھاتی ہیں یا نہیں مگر میں بغیر پان کھائے آپ کا گانا سُننا ایک قسم کی گستاخی سمجھتا ہوں ایک معطر گلوری مُنہ میں ہو اور کانوں میں آپ کی آواز کا رس اُنڈل رہا ہو تو اس دو آتشہ کا کیف مجھ کو واقعی گم کر دیتا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ کوئی مجھ کو نہ ڈھونڈھے۔

شوکت تھانوی

حکیم محمد امین کے نام

گڑھی شاہو۔ لاہور

صدیقِ مکرّم

آپ لکھنؤ بلانے کے لئے لکھتے ہیں کہ آموں اور خربوزوں کا موسم ہے لہٰذا آجاؤ۔ جی ہاں ؎

ہمارے آئی مزاجوں کی سب ہی تدبیر کرتے ہیں
جوانوں کو ان ہی ایام میں زنجیر کرتے ہیں

مگر یہ دانہ جو آپ نے ڈالا ہے اور آم اور خربوزے کا جو دام آپ نے اس عنقا کے لئے بچھایا ہے اُس کا جواب اس عنقا کی طرف سے یہ ہے کہ ؎

برو ایں دام بر مرغِ دگر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ

خربوزہ تو خیر مگر آم کا اپنا ایک مقام ہے پھر لکھنؤ کے آم واقعی انگبین
کے سربھر گلاس ہوتے ہیں۔ مگر آپ کو یہ سُن کر حیرت ہوگی کہ یہاں بھی ملتان
پاکستان کا ملیح آباد بن چکا ہے پچھلے سال ظفر الاحسن صاحب لاری ملتان
کے کمشنر تھے اور ملتان کے آم کھا کھا کر جلایا کرتے تھے چونکہ یہاں بھی آموں
سے عشق ہے لہٰذا ظفر الاحسن صاحب کی حیثیت کامیاب رقیب کی بن کر
رہ گئی تھی مگر جب خود اُن پر اس رقابت کا اظہار کیا تو وہ ملتان بلا لے
گئے اور اعلیٰ درجے کے آم اس قدر کھلائے کہ میں نے گویا گھر دیکھ لیا
پھر کیا تھا فصل بھر یہ ہوتا رہا کہ ہفتے کی شام کو روانہ ہو گئے اتوار کو دن بھر
ملتان کے آم کھائے اور پیر کو لاہور واپس آگئے۔ ؎

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
اے کاش جانتا نہ تری رہگذر کو میں

اسی سلسلے میں ایک مرتبہ ظفر الاحسن صاحب نے لکھا کہ ملتان میں آموں
کی نمائش ہے اور میں انعامات تقسیم کروں گا لہٰذا فوراً آ پہنچو۔ میں آپ سے
کیا عرض کروں کہ اس نمائش میں میں نے کیا دیکھا۔ وہ سب آم جو لکھنؤ
میں چھوڑ آیا تھا مل گئے۔ ثمر بہشت اسی رنگ روپ کا وہی اس کا مزہ
وہی لطافت مگر ڈیل ڈول میں اس سے بھی بڑا۔ دسہری۔ لنگڑا۔ رٹول۔
اور طرح طرح کے دوسرے آم۔ جن آموں کو اوّل۔ دوم اور سوم انعام ملے

تھے ان کے ٹوکرے احسن صاحب نے ساتھ کر دیئے اور سچ تو یہ ہے کہ پچھلے
سال آموں کے معاملہ میں معلوم یہ ہوتا تھا کہ کنواں خود پیاسے کے پاس پہنچ
گیا ہے۔ اس مرتبہ ظفر الاحسن صاحب ملتان کے حاکم اعلیٰ نہیں ہیں مگر
خدا مسبب الاسباب ہے دانے دانے پر مُہر ہوتی ہے جس قدر قسمت
میں ہیں یہاں بھی مل جائیں گے۔ بہر حال یہ اطمینان تو ہے ہی کہ آموں کی
قلمکاری کے نتیجے کامیاب تجربے یہاں بھی ہو چکے ہیں کہ ملیح آباد اور سہارنپور
کے کم و بیشتر تمام آم یہاں پیدا ہونے لگے ہیں۔ بنارس کا لنگڑا ابھی بنارس
سے یہاں تک پہنچنے کے لئے اب کوئی عذر لنگ نہیں کر سکتا البتہ وہ لکھنؤ
سفیدا جو تخمی آموں کا حرف آخر ہے یہاں نایاب ہے۔ سچ پوچھیئے تو یہ لکھنؤ
سفیدا ہی ہے جس نے غالبؔ سے کہلوایا تھا ؎

انگبیں کے بحکم رب النّاس | بھر کے بھیجے ہیں سر بمہر گلاس
رہرو راہ خلد کا توشہ | طوبیٰ و سدرہ کا جگر گوشہ

مگر لکھنؤ سفیدا ابھی اتنی کشش تو نہیں رکھتا کہ اس کے لئے وہ سفر اختیار
کیا جائے جو اب ایک غیر ملک کا سفر ہے۔ البتہ اگر آپ نے لکھا ہوتا کہ
لیسنی پانوں کی بہار ہے الائچیوں کا انبار ہے قوام مہک رہے ہیں اور سب سے
بڑھ کر یہ کہ میں خود پان کھانے لگا ہوں تو میرا جی چاہتا کہ پر پرواز مل جائیں
اور میں اُڑ کر لکھنؤ پہنچوں۔ آپ کو یاد ہو گا کہ ایک مرتبہ عید کے دن آپ نے

پان کھا کر اپنے لبوں کو اس قدر لال کیا تھا کہ ہیں نے نظر بد سے بچانے کیلئے
کالا دانہ آثار نے کی تجویز پیش کی تھی اور یہ واقعہ ہے کہ ؎

دیکھا نہ ہم نے جھوٹ ہیں یاقوت کی کبھو
تھا جو سماں لبوں کے ترے رنگِ پان پر

بڑی بوڑھیوں سے سن رکھا ہے کہ پان کھا کر جس لڑکی کے لب زیادہ
لال ہوتے ہیں اس کا دولہا اس کو بہت چاہتا ہے اور جس لڑکے لب
زیادہ لال ہوتے ہیں اس کی دلہن اس کو بہت چاہتی ہے۔ اس عقیدے
کی تصدیق کم سے کم آپ کے گھر ہیں تو ہو ہی گئی۔ بھابی کے عشق حقیقی کی
اطلاع تو پہلے سے تھی ہی آپ نے پان کھا کر اپنے لبوں کے رنگ سے اس
یقین پر ایک مہر اور لگا دی۔ مگر آپ کا یہ عید بقر عید پان کھانا سمجھ میں نہ آیا
حالانکہ آپ کا اس طبقے سے بھی کوئی تعلق نہیں جو عید بقر عید پان کھاتا ہے
تعجب اس پر بھی ہے کہ آپ کے گھر ہیں پاندان کو بڑی اہمیت حاصل ہے
نہایت نفاست سے پاندان ہر وقت سجا رہتا ہے اور اگالدان تو آپ کے یہاں
ہیں نے اتنا بڑا دیکھا ہے کہ گویا یہ بین الاقوامی اگالدان ہے۔ اچھا خاصا
موبلدھا معلوم ہوتا تھا گویا اگالدانوں کا رستمِ زماں یا ابو الہول کا ذاتی استعمالی
کا اگالدان۔ پاندان بھی مختلف قسم کے موجود ہیں اور سب ہر وقت آراستہ
رہتے ہیں۔ مگر آپ اس اہتمام کے باوجود شاذ و نادر ہی کھاتے ہیں معلوم

نہیں اس میں آپ کی کیا حکمت ہے۔ دریا کے کنارے اس تشنہ لبی میں کیا
مصلحت ہے۔

میں لکھنؤ آنے کو تیار ہوں۔ ذرا یہ لکھ کر دیکھئے کہ آپ نے پان کھانا شروع کر دیا
ہے۔ اب مجھ کو دیکھ لیجئے کہ وہ پان نصیب نہیں وہ صحت مند الائچیاں عنقا
ہیں وہ پُر تکلّف تنباکو اور قوام میسّر نہیں مگر پاندان اس وقت سامنے ہے
ابھی یہ مکتوب ختم کروں گا اور پان اس اہتمام سے بناؤں گا جیسے کوئی مصوّر
اپنی تصویر میں رنگ بھرنے کے لئے ہاتھ کی صفائی دکھاتا ہے۔ ایک تازہ
گلوری کھا کر آپ کے پاندان کا جامِ صحت تجویز کروں گا۔

شوکت تھانوی

حضرت تسکین قریشی کے نام

گڑھی شاہو - لاہور

صدیق مکرم

کون تسکین کو بلائے کہ وہ دیوانۂ عشق
اک جہاں ساتھ میں لایا ہے جہاں آیا ہے

آپ کا پاکستان آنا معلوم نہیں خود آپ کے لئے کیا معنی رکھتا ہو مگر کراچی سے لاہور آ کر میرے لئے جو بزم آپ نے آراستہ کر دی تھی اُس نے لاہور میں بیٹھے ہی بیٹھے مجھ کو کچھ دنوں کے لئے لکھنؤ میں گم رکھا۔ مجھے آپ کے چوڑی دار پاجامہ سے کوئی سروکار نہیں مگر جو پاندان آپ کے ساتھ آیا اور اپنے ساتھ جو اہتمام لایا اس کو میں کنوئیں کا پیاسے تک پہنچنا سمجھتا ہوں اوّل اوّل تو یہ بدگمانی

رہی کہ - ع

ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

مگر بعد میں پتہ چلا کہ ساقی خود اس شراب میں ملا ہوا تھا۔ آپ سمجھتے ہوں گے کہ میرے اور آپ کے تعلقات کی درمیانی کڑی حضرت جگر مرادآبادی ہیں۔ جی نہیں اس سے بھی مستحکم کڑی آپ کا وہ پاندان ہے جس میں ہمیشہ وہ دیسی پان موجود رہتے ہیں جو اس دیار میں، دوا کے طور پر بھی مشکل دستیاب ہوتے ہیں آنکھوں میں لگانے کے لئے بھی بڑی دیدہ ریزی کے بعد ملتے ہیں اور یہ پان اگر مل بھی گئے تو ان کی ناز برداری کا سلیقہ کوئی کہاں سے لائے گا ؎

اہلِ محفل اور جنونِ لذت کام و دہن

کس سے کہیے رسم و راہِ مے کشی ہوتی ہے کیا

ان پانوں کے لئے وہ آپ کی جستجو۔ پھر آپ کی اس طلبِ صادق کے ثمر کے طور پہ گویا ان پانوں کا آپ کو ملنا پھر آپ کا ان پانوں کو لیکر بیٹھنا ان کو بڑے چاؤ سے سنوارنا۔ کتر بیونت کرنا۔ چھوٹے چھوٹے تعویذ نما پان بنا کر ڈبیا میں رکھنا۔ اہلِ ذوق کے سامنے بڑی سرخروئی سے وہ ڈبیا پیش کرنا اور کور ذوقوں کی دست درازی پہ دل ہی دل میں کڑھ کر زبانِ حال سے یہ کہنا کہ ؎

سجائی تو ہے بزم واعظ نے لیکن

دلوں کی کمی ہے نگاہیں بہت ہیں

یہ تمام وہ باتیں تھیں جو مشرب کی یکسانیت کے باعث مجھ کو اپنے سے دُور نہ رکھ سکیں ورنہ ہمارے یہاں مشرب کی یہ رنگینی کہاں۔ یہ پان اور پان کے لئے یہ اہتمام کہاں۔ خدا نہ کرے کہ یہ پان کسی ایسے خون لگا کر اپنے کو شہیدوں میں شامل کرنے والے کے ہاتھ لگ جائے جو اس میں سونف اور سونٹھی کا سفوف تک ڈال کر اس کو گھٹی اور اپنے منہ کو زچہ خانہ بنا ڈالے۔ اور خدا نہ کرے کہ یہ پان کسی ایسے پان کھانے والے کے ہاتھ لگ جائے جو اس پان میں اور اُس پٹ سن نژاد پان میں کوئی فرق نہ کر سکے جو یہاں پان کے نام سے استعمال ہوتا ہے۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ میں نے پان اُسی دن ترک کر دیا تھا جب اس عجیب الطرفین پان کا ملنا اپنے امکان میں نہ رہا مگر پان سے قطعی توبہ صرف اس لئے نہ کی تھی کہ ؎

توبہ اور صحبتِ دیرینۂ رنداں اے دل
یہ بھی سوچا ہے کہ گردش میں اگر جام آیا

لہٰذا میں نے پان ترک کر دیا مگر اس کے اجزا استعمال کرتا رہا یعنی گُشکا۔ چھالیا۔ خشک کتھا۔ الائچی۔ تمبا کو اور چُونا۔ ان اجزا میں البتہ اہتمام ملحوظِ خاطر رہتا تھا۔ بہت نفاست سے چھالیہ کتروا تا تھا۔ الائچیاں ذرا تندرست قسم کی فراہم کرتا تھا۔ تمباکو بہتر سے بہتر منگاتا رہتا تھا اور اس سلسلے میں ہر ممکن

تکلف برتنا ضروری سمجھتا تھا کہ قوام ہی ذرا اچھے قسم کا مل جائے۔ تمباکو ہی زعفرانی ہو۔ مشکی دانہ ہی دستیاب ہو جائے بہر حال پان کا غم اسی طرح غلط کرتا رہا اور اس گٹکے کے متعلق ہمیشہ یہی سمجھتا رہا کہ ؎

اب زندگی کے شوق کا عنوان ہی اور ہے

رکھا ہے غم کا نام مسرت ترے لئے

بات یہ ہے کہ دیسی پان کی موجودگی میں گٹکا کھانا میرے نزدیک کفرانِ نعمت ہے۔ مگر دیسی پان کے بجائے یہ پٹ سن کے پتے کھا لینا میرے مشرب میں صریح شرک ہے۔ لوگ میرے اس جنون پہ ہنستے ہیں کہ میں اس ذرا سے سبز پتے کو اتنی اہمیت دیتا ہوں اب میں ان کو اس ذرا سے سبز پتے کی اہمیت کس طرح سمجھاؤں ؎

کہنے کو دل میں کچھ بھی نہیں جز خیالِ یار

لیکن خیالِ یار کی وسعت نہ پوچھئے

آپ نے دل اور پان کی ساخت پر تو غور کیا ہی ہوگا۔ کس قدر ملتی جلتی شکل ہے دونوں کی، پھر دونوں کو کھائیے تو عرق دونوں کا سُرخ ہی ہوتا ہے یہ تو خیر میں یوں ہی ایک غیر متعلق سی بات کہہ گیا۔ عرض یہ کر رہا تھا کہ اس ذرا سے سبز پتے سے ہماری کتنی روایات وابستہ ہیں۔ یہ صرف ایک برگِ سبز نہیں ایک مستقل معاشرہ ہے۔ ایک مستقل مشرب ہے ایک مستقل مزاج

ہے اور یہ باتیں ہر ایک کو سمجھائی نہیں جا سکتیں۔

میں نے آپ کی موجودگی میں یہ اصل نسل کے پان مسلسل کھائے اور جب آپ پاکستان سے مع اپنے پاندان اور خاندان کے رخصت ہو رہے تھے اُس وقت تو میں نے گھبرا گھبرا کر اتنے پان کھائے تھے کہ ہونٹوں پر لاکھا جم گیا تھا حالانکہ یہ گہرا رنگ اس خطرے سے بھی آگاہ کر رہا تھا کہ ؎

ہو نے کو ہے پھر خونِ تمنّا
بڑھنے لگی پھر رنگینیٔ دل

مگر کیا کرتا۔ مجبور تھا۔ جانتا تھا کہ محفل کے بعد پھر یہ رنگِ محفل کہاں۔ چنانچہ اب پھر میں ہوں اور میرا وہی گٹکا۔ یعنی میں گٹکے کی ایک خوراک کھا رہا ہوں۔

شوکت تھانوی

نسیم ممتاز سیّد کے نام

گڑھی شاہو - لاہور

سیّدنا !

آپ کو مجھ سے یہ شکایت ہے کہ میں اپنے کو موقع اور محل کے سانچے میں کبھی نہیں ڈھالتا بلکہ یہ چاہتا ہوں کہ ہر موقع اور ہر محل خود میرے ہی سانچے میں ڈھلتا رہے۔ آپ مجھ کو ہمیشہ یہ مشورہ دیتے ہیں کہ ؎

زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز

مگر اب آپ ہی بتائیے کہ اس قسم کے موقعوں پر میں کیا کر سکتا ہوں کہ ابھی ملتان کے سفر سے واپس آیا ہوں۔ شامتِ اعمال کہیے یا قہرِ خداوندی کہ

جن صاحب کا ملتان میں مہمان بن کر رہا وہ صرف صاحب ہی نہیں بلکہ صاحب بہادر نکلے خالص مغربی وضع کا ان کا گھر ہے جس میں بیرے اور خانساماں گوران شاہی اُردو بولتے پھرتے ہیں کہ "غسل لگادیا ہے صاحب" اور "لنچ لگادیا ہے صاحب" مگر قسم لے لیجئے جو کسی نے یہ کہا ہو کہ "پان لگادیا ہے صاحب" اس گھر میں دُنیا کی ہر نعمت موجود تھی۔ ہوا خوری کے لئے ہر وقت موٹر حاضر ہے۔ کھانے کے لئے بین الاقوامی کھانے ہیں۔ فریجیڈیر کے یخ بستہ پھل ہیں۔ اعلیٰ سے اعلیٰ اقسام کے سگریٹ اور سگار ہیں۔ رہنے کے لئے مکلّف کمرہ ہے۔ سونے کے لئے لچکدار مسہری ہے۔ غسل خانہ اتنا پُر تکلّف کہ غسل کرنے کے معاملے میں قضائے عمری پڑھنے کو جی چاہے۔ میزبان کی مہمان نوازی کا یہ عالم کہ ابھی سینما کا پروگرام بن رہا ہے تو ابھی پکنک کی تیاریاں شروع ہو گئیں مختصر یہ کہ بیچارے بچھے جاتے ہیں۔ فرشِ راہ ہوئے جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہے مگر پان ندارد۔ نہ ان کے گھر میں پاندان ہے نہ خاصدان۔ نہ اگالدان ہے نہ محض پان۔ اور اُفتاد یہ آپڑی کہ میرے سفری پاندان کا تمام سامان ختم ہو گیا۔ اب میں کس سے کہوں کہ پان تو خیر آپ کیا لائیے البتہ چھالیہ ہی فراہم کر دیجئے۔ میری اس طلب کو ایک تو کوئی سمجھتا ہی نہیں اور اگر میزبان صاحب نے میری یہ تکلیف محسوس بھی کی تو دوسرے سگریٹ کا ڈبہ لے کر کہ لیجئے اسی سے پان کا غم غلط

کیجئے۔ ؎

اہلِ تدبیر کی واماندگیاں
آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں

ملتان میں آپ کہیں کہاں پاتا کہ آپ میرے لئے ڈھونڈھ کر وہ پان لاتے جو طبع شورش پسند کو سرمستیوں کی اور فکر عالم آشوب کو آسودگیوں کی دعوت دیا کرتے ہیں۔ آپ کے پان کھانے سے زیادہ پان کھلانے کے سلیقے کا میں ہمیشہ قائل رہا ہوں اور کچھ آپ ہی محسوس کر سکتے ہیں کہ پانوں کی اس بے مائگی نے مجھ پر کیا قیامت توڑی ہو گی۔ جب پان ختم ہو گئے تو تیمم شروع کر دیا دہی گنگلے والا نسخہ کام آیا مگر جب چھالیہ بھی ختم ہو گئی تو وہ وقت قریب تھا کہ میں اپنے میزبان کی اس پیشکش کو قبول کر لوں کہ بازار ہی سے پان آجائیں مگر کیچڑ میں لتھڑے ہوئے ان موٹے موٹے پتوں کے تصور ہی سے ایک جھرجھری لیکر رہ گیا اور بمشکل تمام صرف یہ گوارا کر سکا کہ بازار سے چھالیہ آجائے۔ ؎

پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

مگر میں آپ سے کیا عرض کروں کہ جب یہ چھالیہ میرے سامنے آئی تو میرا کیا حال ہوا معلوم ہوا کہ میں کوئی عمارت بنانے کا ارادہ رکھتا ہوں اور بجری کا یہ نمونہ میرے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ اسی قسم کی بے ڈول چھالیہ میں بھائی جان

یعنی آپ کے والد محترم کے بٹوے میں بھی دیکھ چکا ہوں ۔ کس قدر حسین ڈبیا
ہیں کیسے کیسے نازک اندام ٹکڑے کس اہتمام سے وہ رکھتے ہیں پھر قوام
بھی بڑی دوڑ دھوپ کے ساتھ ان کے لئے مہیا کیا جاتا ہے مگر چھالیہ بھی ہوتی
ہے جسے کھانے کے بعد لوہے کے چنے چبانے کا لطف آتا ہے اور جبڑوں
کی ورزش ہوتی رہتی ہے ۔ پانوں کے سلسلے میں یہ اہتمام اور چھالیہ کے
باب میں یہ عجز میری سمجھ میں نہیں آتا حالانکہ سنا ہے کہ لاہور میں سب سے پہلا
گھر آپ کا تھا جہاں پاندان پایا گیا اور اسی گھر سے پان کھانے کی رسم
چلی ۔ بہرحال میں ذکر کر رہا تھا ملتان کا کہ جب وہ چھالیہ کے موٹے موٹے
ٹکڑے میرے سامنے آئے تو کچھ ایسی کیفیت مجھ پر طاری ہو گئی جس
کی تھوڑی بہت تشریح ان الفاظ میں ہو سکتی ہے کہ "نگلے تو اندھا اور
اُگلے تو کوڑھی" ۔ ع

نے تابِ وصل دارم نے طاقتِ جدائی

اتفاق سے اسی وقت ایک شاعر دوست آنکھوں میں نیند کا خمار
اور لبوں پہ پان کی دھڑی لئے آموجود ہوئے شاید آپ ان سے ملے ہوں ۔
جناب صابر دہلوی ۔ ان کو اس عالم میں دیکھتے ہی میں بے ساختہ کہہ اُٹھا ۔

خوشا اقبالِ رنجوری عیادت کو تم آئے ہو
فروغِ شمعِ بالیں طالعِ بیدارِ بستر ہے

سب سے پہلے اُن سے پان کی فرمائش کی چنانچہ ان کی جیب سے فوراً ڈبیا نکلی دوسری جیب سے بٹوہ نکلا۔ مگر ڈبیا میں وہی جنس کثیف اور بٹوے میں وہی کنکر پتھر۔ میں نے حیرت سے اُن کا مُنہ دیکھ کر پوچھا "یہ کیا" وہ نہایت اطمینان سے بولے "اب اسی کو غنیمت سمجھتا ہوں" اور پھر اصرار کہ میں بھی یہ بدمذاقی شروع کر دوں ۔ ع

زہر دے اُس پہ یہ تاکید کہ پینا ہوگا

میں نے اُن سے کہا کہ میں پان کھانا چھوڑ سکتا ہوں مگر یہ ناممکن ہے کہ یہ گندگی اُچھالنا شروع کر دوں۔ اس وقت سے آپ مجھ کو برابر یاد آتے ہیں کہ واقعی آپ درست کہتے ہیں کہ میں اپنے کو موقع اور محل کے سانچوں میں ڈھالنے سے قاصر ہوں ۔ میں نے ملتان میں پان کا روزہ رکھا تھا جو اب لاہور آ کر افطار کیا ہے۔ مگر وہ بیہودہ پان کھا کر میں نے اپنے اس ذوق کی آبرو ریزی نہیں کی ۔

شوکت تھانوی

مولوی عبدالرؤف عبّاسی کے نام

گڑھی شاہو۔ لاہور

حبیبی!

آج ایک صاحب تحفہ کے طور پہ چکنی ڈلی لائے ہیں۔ گنگنے کے ساتھ چکنی ڈلی کھا رہا ہوں اور آپ کو یاد کر رہا ہوں۔ چکنی ڈلی کی چاٹ تو دراصل آپ ہی کی لگائی ہوئی ہے اور یہ واقعہ ہے کہ مشترکہ ہندوستان میں خوش مذاقی کے ساتھ پان کھانے والے اگر انگلیوں پہ گنے جائیں تو آپ کا نام سرِ فہرست ہی رکھنا پڑے گا۔ یہ اہتمام کم سے کم میری نظر سے کہیں اور نہیں گذرا کہ چاندی کی ڈبیا میں گلوریاں الگ موجود ہیں۔ خاصدان الگ بھرا ہوا ہے پھر بھی بٹوہ اور چھوٹی بھی احتیاطاً موجود ہے اور رکھنے کی

میز ہی پہ ایک چھوٹا سا پاندان بھی رکھا ہوا ہے۔ پھر یہ کہ پان ہیں تو بہترین قسم کے۔ تمباکو ہے تو بازار کی سب سے زیادہ قیمتی۔ الائچیاں ہیں تو صرف ہری نہیں سفید بھی اور خاص ان میں شالباف کی ہمانی کے اور چنبیلی کے کھلے ہوئے پھول بھی نظر آرہے ہیں تاکہ پان کا شدید سے شدید کافر بھی پان پر ایمان لائے بغیر نہ رہ سکے۔ اور خود آپ کا یہ طریقہ کہ ابھی پستی پانوں کی معطر گلوریاں نوش فرمائی ہیں تو اب ذرا منہ کا مزہ بدلنے کے لئے ڈلی سے شغل ہو رہا ہے اور باریک ترشی ہوئی چکنی ڈلی ہتھیلی پہ تولی جا رہی ہے، تاکہ دیکھنے والے کہہ سکیں کہ ؎

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی
زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیئے

خیر اس اہتمام کا تو کوئی جواب ہی نہیں مگر اس وقت جو ڈلی میسر آگئی ہے، اس کو بھی میں حیرت سے دیکھ رہا ہوں اور عالم یہ ہے کہ ؎

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیئے
ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیئے

یہ چکنی ڈلی وہ لکھنؤ والی چکنی ڈلی ہرگز نہیں ہے جس کو نوک پلک کی احتیاط کے ساتھ ترشا جاتا ہے اور اس کی نہایت سڈول چھوٹی ٹکیاں بنانے میں پوری صناعی سے کام لیا جاتا ہے یہ تو سوکھے ہوئے بیروں کی شکل

کی کوئی چیز ہے مگر کھانے میں اس چکنی ڈلی کے مزے سے قریب تر ہے جو آپ استعمال کرتے ہیں مگر اس واجبی سی شکل صورت کی چکنی ڈلی کے میسّر آنے کا بھی یہ نتیجہ ہوا ہے کہ بٹوہ بڑے اہتمام سے سجایا جا رہا ہے موٹی موٹی الائچیاں ڈھونڈھ کر لائی گئی ہیں۔ کتھے کی پپڑیاں جمائی گئی ہیں عید بقر عید کے لئے جو تھوڑا سا مشکی دانہ رکھ چھوڑا تھا نکالا گیا ہے۔ قوام کی ایک سربمہر شیشی کھولی گئی ہے مختصر یہ کہ عالم یہ ہے کہ ؎

کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کئے ہوئے

اور اس کی پہلی ہی خوراک کھانے کے بعد جی چاہتا ہے کہ صرف آپ کو مخاطب کر دوں ؎

عارضِ گل دیکھ روئے یار یاد آیا اسدؔ
جوششِ فصلِ بہاری اشتیاق انگیز ہے

میرے تصوّر میں اس وقت بھی آپ کی وہی بزم آرائی ہے جس میں تمام یارانِ میکدہ جمع ہوں گے خاصدان دور میں ہوگا اور بٹوہ اِدھر سے اُدھر اچھل رہا ہوگا۔ ؎

اُس کی بزم آرائیاں سُن کر دلِ رنجور یاں
مثلِ نقشِ مدعائے غیر بیٹھا جائے ہے

وہ محفلیں خواب ہو گئیں اور جہاں تک میرا تعلق ہے یہ محفلیں آراستہ بھی ہوتی ہیں تو صرف خیال ہیں۔ رفیع احمد خاں مرحوم کی رحلت نے اس بزم کو یوں ہی سونا کر دیا تھا اس پر طرّہ تقسیم ملک نتیجہ یہ کہ سب ہی تتر بتر ہو گئے

اچھّی تھی وہ ساعت کہ جب آپس میں ملے تھے
اب تیر کہیں ہے دلِ مجروح کہیں ہے

مگر آپ کی بزم تو بدستور آراستہ ہے ع

ہم نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی

وہی مرشد آباد پیلس ہے وہی آپ ہیں اُسی انگور کی بیل کے سائے ہیں سہ پہر کی محفلیں جمتی ہوں گی شعر و ادب کی بحثیں چھڑتی ہوں گی لطائف کی بھرمار ہوتی ہوگی۔ سیاسی گتھیاں سلجھا سلجھا کر اُلجھائی اور اُلجھا اُلجھا کر سلجھائی جاتی ہوں گی خیر یہ سب کچھ تو یہاں بھی ممکن ہے مگر ہاں وہ پان والے پان کاش آپ کو اندازہ ہوتا کہ یہی پان جس کو آپ کھا کر تھوک دیتے کی چیز سمجھتے ہیں اگر اس طرح دستیاب ہو جس طرح یہاں دستیاب ہوتا ہے تو کتنی بڑی نعمت ہے یہاں کی ہر محفل میں اُسی پان کی کمی محسوس ہوتی ہے اور یہ کمی کچھ اس قسم کی ہوتی ہے جیسے لبِ جو ہو۔ گھنگھور گھٹائیں ہوں کیف آور اور بادہ طلب ہوائیں ہوں سب کچھ ہو مگر مئے گلرنگ نہ ہو۔ صرف ایک مئے گلرنگ کا نہ ہونا اس تمام اہتمام کو بے معنی بنا دیتا ہے۔ ہونا چاہیئے مئے گلرنگ کو خواہ

ان میں سے ایک آدھ چیز نہ بھی ہوئے

تم ہو میرے گلرنگ ہو، میں ہوں لب جو ہو
پھر ابر بہاری جو نہ برسے تو نہ برسے

مگر جب میرے گلرنگ ہی سر سے غائب ہو تو یہ تمام اہتمام بے دولہا
کی برات بن کر رہ جاتا ہے۔ بہرحال آج جبکہ چکنی ڈلی میسّر ہے ان محرومیوں
کا ذکر کفرانِ نعمت ہے۔ میں پھر گنگلے کی ایک خوراک تیار کرتا ہوں اور ایسے
کھا کر آپ کا اور آپ کی محفل کا جامِ صحت تجویز کرتا ہوں اور اپنی محرومیوں
کی داستان سے آپکے لطفِ انجمن آرائی کو بے کیف کرنا نہیں چاہتا اور
مجھ کو یہ بھی گوارا نہیں کہ ؎

تیرے چہرے سے ہو ظاہر غمِ پنہاں میرا

شوکت تھانوی

مولانا نیاز فتحپوری کے نام

گڑھی شاہو۔ لاہور

حبیبی!

تقسیمِ ملک کے بعد ہم دونوں کے درمیان یہ طے ہُوا کہ ؂

مقامِ ناز ہے میرے لئے جہاں میں ہوں
جہاں نیاز کی حد ہے وہاں نیاز رہے

ہر چند کہ آپ کے متعلق مجھ کو معلوم ہے کہ آپ خواہ ہندوستان میں رہیں یا پاکستان میں اپنی ایک مخصوص دُنیا خود ہی وضع کر کے رہتے ہیں اور اپنے دائرے سے باہر کی دُنیا سے آپ کا بہت ہی کم تعلق رہتا ہے آجکل دُنیا

کے ساتھ آپ کے تعلقات کیا ہیں اس کا مجھے علم نہیں اس لئے کہ تقریباً نو سال سے نہ میں نیاز حاصل کر سکا نہ نگاہ ہی میرے مطالعہ میں رہا مگر اس سے پہلے تو خدا اور اُس کی کائنات تک آپ کے دائرے سے باہر تھے اور آپ کے متعلق مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ؎

وہ اس غریب نے پایا نہیں مقدر سے
میر نیاز کے قابل جو آستانہ تھا

آپ کی اسی کیفیت کو کسی نے تکبر سمجھا کسی نے تعجب سے کہا کہ نیاز اور یہ بے نیازی - اور کسی نے یہ کہہ کر صبر کر لیا کہ جو خدا کو خاطر میں نہ لایا وہ خدا کے بندوں کو کس شمار قطار میں سمجھتا ہے اور آخر کار آپ کی اس بیگانہ وشی نے یہ صورت اختیار کر لی کہ ؎

خدا معاف کسی اور کا تو ذکر ہی کیا
نیاز مند ترے تجھ سے بے نیاز ہے

میرے اور آپ کے مراسم خوردی اور بزرگی کے علاوہ کچھ اس قسم کے بھی تھے کہ ؎

وہ ناز آفریں تھے انھیں اس پہ تھا غرور
میں تھا نیاز مند مجھے اس پہ ناز تھا

مگر رفتہ رفتہ دل و دماغ نے باغی ہونا شروع کر دیا اور اس جذبہ نے انگڑائی لی کہ اگر اس طرف خیالِ خاطرِ اہلِ نیاز ایک سرے سے ہے ہی نہیں تو اہلِ نیاز

کی نیاز مندیوں کی بھی آخر ایک حد ہونا چاہیئے۔ آخر یہ اُن سے کب تک کہا جائے کہ ؎

یہ تیرِ ناز ہیں تو شوق سے چلائے جا
خیالِ خاطرِ اہلِ نیاز رہنے دے

اور شاید آپ کی شخصیت کی محبوبیت اس باغیانہ جذبہ کو بھی سرد کر دیتی مگر لکھنؤ سے جب مجھ کو لاہور آنا پڑا اور آپکے ایک دوست کے مکان میں میرے بیوی بچے عارضی طور پر کرایہ پر اس لئے رہ گئے کہ مجھ کو لاہور میں مکان حاصل کرنے کے بعد اُن کو بلانا تھا۔ اس موقع پر آپنے اس دیرینہ نیاز مند کا بھی خیال نہ کیا اور بجائے اس کے کہ میری عدم موجودگی میں آپ میرے متعلقین کے لئے باعثِ تقویت بنتے ان کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ فوراً اپنے لئے کوئی اور مکان تلاش کریں۔ وہ وقت تو خیر گذر ہی گیا مگر باوجود کوشش کے میں اس واقعہ کی تلخی کو نہیں بھلا سکا کہ دنیا میں یعنی آپ کی دُنیا میں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس قدر جلد نگاہیں بدل جائیں ؎

اللہ ری چشمِ یار کی معجز بیانیاں

خیر چھوڑیئے اس تکلیف دہ ذکر کو نو سال کی اس دیرینہ شکایت کو آج معرضِ اظہار میں لا کر اب میں اپنے کو سبکدوش محسوس کر رہا ہوں بلکہ یہاں "سبکِ قلب" کی ترکیب ذہن میں آ رہی ہے۔ شکایت بھی ایک امانت

ہوتی ہے جو آج میں نے آپ تک پہنچا دی۔

اس کڑوی بات کا اثر دُور کرنے کے لئے میں اپنے پاندان کی طرف بڑھ رہا ہوں تاکہ ایک تازہ گلوری کھا کر اپنے محسوسات کو آپ کے لئے بے داغ بنا سکوں اور جس دل میں غبار تھا وہ آپ کے لئے پھر کشادہ ہو سکے۔ آپ بھی اپنی میز پر رکھے ہوئے "لے بی آگالدان" میں اُگال تھوک دیجئے اور ڈبیا سے ایک تازہ پان نکال کر کھایئے اور بٹوے سے چھالیہ اور تمباکو نکال کر پھانک لیجئے تاکہ آپ کی فضائیں بھی بدل جائیں اور اس تمام قصہ کو آپ بھی بھلا دیجئے جس طرح میں یہ کہہ کر بھلا رہا ہوں کہ ؎

ہم سے نظر پھیر لی اس شوخ نے
ہم بھی ہیں انسان خفا ہو گئے

کسی جگہ آپ کی تازہ ترین نصویر دیکھ کر میں آپ کی تیز گامی کا قائل ہو گیا یہ انقلاب اور اس قدر جلد خیر بوڑھا تو آدمی ہوتا ہی ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ کوئی آخر کہاں تک بوڑھا نہ ہو آپ نے اپنے اوپر پیری کا غلبہ اتنے ہی دنوں نہ ہونے دیا یہی کیا کم ہے مگر میرے نزدیک تو بڑھاپے کا عبرت انگیز دَور اُس وقت شروع ہوتا ہے جب ایک پان کھانے والا پان نہ کھا سکے مسوڑھے چھالیہ چبانے کا حق ادا نہ کر سکیں اور آپ کی تصویر دیکھ کر یہ اندیشہ یقیناً پیدا ہوتا ہے کہ کہیں یہ تکلیف دہ صورت تو نہیں پیدا ہو گئی ہے یہ

تو طے ہے کہ آپ پان چھوڑ نہیں سکتے بڑے کہنہ مشق پان خور واقع ہوئے ہیں۔ ہر چند کہ آپ کے پان کھانے میں نہ کوئی تکلف ہوتا تھا نہ کوئی نمائش البتہ پابندی ضرور تھی اور پان آپ قضا نہ ہونے دیتے تھے۔ حد یہ ہے کہ جس "اُگالدان سلمہٗ" کا میں نے ذکر کیا ہے وہ آپ کی لکھنے کی میز پر قلمدان کے برابر ہی ہمیشہ نظر آیا ایسے رند سے ترکِ مے کی اُمید تو نہیں ہو سکتی البتہ خدا کرے آپ اپنی تصویر کی طرح اتنے بوڑھے نہ ہوئے ہوں کہ پان سے بھی بے نیاز ہو گئے ہوں۔

شوکت تھانوی

سیّد ذوالفقار علی بخاری کے نام

گڑھی شاہو۔ لاہور

سیّدی!

ابھی قوام کی نقرئی گولیاں لایا ہوں اور آپ کو یاد کر رہا ہوں۔ صرف آج ہی یاد نہیں کر رہا ہوں جب کبھی یہ گولیاں لاتا ہوں آپ یاد آجاتے ہیں اور اس قدر ہولناک طریقہ پر یاد آتے ہیں کہ آج بھی میں دم بخود رہ جاتا ہوں۔ غالباً آپ بھی نہ بھولے ہوں گے انجمن ترقی اُردو کے زیرِ اہتمام منعقد ہونے والی اس اُردو کانفرنس کو جو کراچی میں ۱۳ اپریل ۱۹۵۱ء کو شروع ہوئی تھی اور ۱۴ اپریل کو اسی کانفرنس کی مجلس موضوعات کا اجلاس سردار عبدالرب نشتر گورنر پنجاب کی صدارت میں ہو رہا تھا مندوبین کی صف

میں آپکے قریب ہی میں بھی بیٹھا تھا اور قوام کی گولیوں کی شیشی جو ابھی لیکر آیا تھا
کھول رہا تھا کہ آپنے مجھ سے پوچھا کہ یہ کیا ہے اور جب میں نے عرض کیا کہ قوام
کی گولیاں ہیں تو آپ نے حسبِ معمول ناک بھوں چڑھا کہ گویا اس لغویت پر ایک
خاموش تبصرہ فرمایا تھا۔ میرا جی تو چاہا کہ آپ سے اُسی وقت عرض کردوں کہ ؎

کس لئے جان دیتے ہیں رندِ شرابِ ناب پر
پوچھ نہ روزِ محتسب تھوڑی سی آج پی نہ دیکھ

مگر اس سے قبل کہ میں کچھ عرض کردوں آپ نے شیشی میرے ہاتھ سے لے لی اور
ایک گولی جس کا نصف حصہ میں ایک خوراک میں کھاتا تھا جلدی سے مُنہ میں
ڈال لی۔ بغیر پان کے یہ پوری گولی آپنے ان تیوروں سے کھائی کہ بجائے آپکے
میں چکرا کر رہ گیا ؎

میں نے چکھی بھی کہ ساقی نے کہا جوڑ کے ہاتھ
آپ للّٰہ چلے جائیے میخانے سے

میں ابھی کچھ عرض بھی نہ کرنے پایا تھا کہ کسی زیرِ بحث تجویز پر ڈاکٹر عبدالحق نے آپ
کا نام لیا اور آپ وہ شیشی ہاتھ میں لئے تقریر کرنے کھڑے ہو گئے اور اس انداز
سے کھڑے ہوئے گویا مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ ؎

دم بخود ہیں حضرتِ زاہد یہیں تک دیکھ کر
ہوش اُڑ جانے اگر شیشے کے باہر دیکھتے

چنانچہ آپ نے یہ ہوش اُڑانا بھی اس طرح شروع کر دیئے کہ تقریر جاری ہے اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ایک گولی نکالتے ہیں اور منہ کے اندر اُچھال دیتے ہیں۔ دو چار منہ تقریر کرتے ہی ہیں چلائے اور پھر ایک گولی چٹکی میں لیکر منہ کی طرف روانہ کر دی۔ اور یہاں یہ عالم کہ ؎

ہم اپنے چہرے پہ اُڑتی ہوائیاں دیکھیں

کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کریں تو کیا کریں شیشی ہاتھ سے چھیننا آدابِ مجلس کے خلاف۔ آپ کو ٹوکنا حد درجہ معیوب سی بات۔ پھر یہ بھی طے کہ اگر یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا تو آپ گرے بغیر نہیں رہ سکتے۔ کئی مرتبہ ارادہ کیا کہ جہنم میں گیا آدابِ مجلس کا پاس یہ زندگی اور موت کا معاملہ ہے۔ یہاں تک کہ آپ کے علاوہ خود اپنی موت بھی نظر آنے لگی کہ اگر آپ کو خدانخواستہ کچھ ہو گیا تو دھرے جائینگے ہم بھی اور یہ سوال یقیناً پیدا ہوگا کہ ؎

ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

طرح طرح کی باتیں بنیں گی کہ نہ جانے کب کی دشمنی چکائی ہے اور میں کسی کو نہ سمجھا سکوں گا کہ یہ چھینا میں نے نہیں چبوایا خود بدولت نے اپنی مرضی سے یہ اقدامِ خودکشی کیا ہے۔ میں انتظار کرتا رہا کہ اب آپ کہنے ہی والے ہیں حاضرینِ مجلس سے کہ حضرات معاف کیجئے گا ؎۔

مستی سے درہمی ہے مری گفتگو کے بیچ

مگر نہ آپ نے یہ کہا نہ تقریر یہ ادھوری چھوڑی نہ تقریر کے بعد ہی کسی سے
کہا کہ ؎

یا ہاتھوں ہاتھ لو مجھے مانندِ جام مے
یا تھوڑی دور ساتھ چلو میں نشے میں ہوں

حالانکہ وہ پوری شیشی خالی ہو چکی تھی جس میں پچاس گولیاں تھیں یعنی میری سو
خوراکیں اور میں واقعی پریشان تھا کہ اب ہوگا کیا مگر آپ کو کچھ بھی نہ ہوا اور
کیوں نہیں ہوا یہ بات آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اللہ جانے یہ آپ کے
ظرف کی بات تھی یا میرے مقدر کی خوبی۔

آپ کے تمام مشاغل کچھ اسی قسم کے ہیں۔ مثلاً آپ باقاعدہ پان کھانے
والوں میں نہیں ہیں۔ مگر کھانے پہ آئیں گے تو اس تواتر اور تسلسل کے ساتھ
کھائیں گے گویا ؎

رات سے آ گئے جو پینے پر   صبح تک آفتاب ہیں ہم لوگ

کسی کو شبہ بھی نہیں ہو سکتا کہ یہ حضرت جو اس شدت سے پان کھا رہے ہیں دراصل
پان کے بالکل عادی نہیں ہیں۔ دیکھنے والے تو صرف یہ دیکھیں گے کہ ؎
نہر پر چل رہی ہے پن چکی

شعر و شاعری کا عالم بھی کچھ اسی قسم کا ہے اپنی ذمہ دارانہ مصروفیتوں میں اس
طرح منہمک رہیں گے کہ کسی کو شبہ بھی نہ ہو سکے کہ ایسے مصروف انسان کا

کوئی تعلق شعر و شاعری سے بھی ہو سکتا ہے مگر اپنی شام کی مجلس میں شاعری شروع کی تو اُن مصروفیتوں کا اعتبار اُٹھ گیا جن میں دن بھر مبتلا رہے ہیں اور اندازہ ہوا کہ زندگی بھر اگر ان صاحب نے کچھ کیا ہے تو صرف شاعری ورنہ بیہ پختگی ۔ یہ کہنہ مشقی اور یہ برجستگی ناممکن تھی مگر اس بزم کے برہم ہوتے ہی آپ پھر کچھ کے کچھ بن گئے ۔ میں اس ہمہ گیری کا مخالف نہیں ہوں البتہ عرف یہ عرض کرنا ہے کہ اگر شعر و شاعری کی طرف آپ سنجیدگی سے متوجہ نہ ہوئے تو ہمارے شعری ادب کا نقصان ہے اور اگر پان کی طرف سنجیدگی سے متوجہ ہو گئے تو ہم پان کھانے والے اس میدان سے بھاگ کھڑے ہوں گے ۔

شوکت تھانوی

ڈاکٹر عبادت بریلوی کے نام

گڑھی شاہو۔ لاہور

محبّ مکرّم!

سنا بھی یہی تھا اور پڑھا بھی یہی کہ ؎

اگر پدر نتواند پسر تمام کند

مگر جہاں تک پان کا سوال ہے آپ کے والد محترم و معظّم نے "نتواند" والی بات ہی پیدا نہ ہونے دی اور اس ذوق میں اس فیاّضی سے کام لیا کہ پسر کے حصّے میں کچھ نہ آسکا آج بھی اگر کہیں سرِ راہے بھی ملاقات ہو جائے تو علیک سلیک کے بعد ہاتھ بجائے مصافحہ کے لئے بڑھنے کے اُن کے اُس تھیلے میں جاتا ہے جس میں پانوں کی ڈبیا اور بٹوہ ہوتا ہے اور وہ عموماً کیفیت مزاج پان کھلانے

کے بعد ہی پوچھتے ہیں اس لئے کہ ان کو معلوم ہے کہ پان کھلائے بغیر کسی کا مزاج کیونکر بخیر ہو سکتا ہے۔ اب تو خیر "پٹھنوری" دوسری چیز ہے ورنہ در اصل ان کا ضعیفی کا عالم ہے یہ بھی ان کا حوصلہ ہے کہ قویٰ کا اضمحلال ظاہر نہیں ہونے دیتے اور اپنے تیوروں سے عناصر کے اعتدال کا یقین دلاتے رہتے ہیں ورنہ جب لکھنؤ میں ان کا شباب تھا اُس وقت ان کی اس پانوں کی ڈبیا پر بھی بھرپور جوانی آئی ہوئی تھی۔ جس ڈبیہ میں آج اس نام نہاد پان کے ٹکڑے تہہ بہ تہہ رکھے نظر آتے ہیں اسی ڈبیا میں پستئی پانوں کی معطر گلوریاں پہلو بہ پہلو پڑے جمائے دکھائی دیتی تھیں مگر ع

یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جوان تھا

خیر وہ تو اپنا اور اپنی جوانی کا حق ادا کر چکے اور وضعداری آج بھی ان میں موجود ہے۔ مخاطب نواب آپ ہیں اور آپ آتش نہ سہی مگر جوان تو بہر حال ہیں نوجوان میں اس لئے نہیں کہتا کہ ابھی ۱۹ مئی کو آپ کی نوجوانی اپنا اچھوتا پن کھو چکی ہے۔ شادی کے بعد جنسِ لطیف کے لئے اگر دوشیزگی کی ترکیب بے محل ہو جاتی ہے تو جنسِ قوی کو بھی نوجوان کہنا اسی قسم کی زیادتی ہے۔ بہر حال اب دیکھنا یہ ہے کہ شادی کے بعد آپ میں کیا انقلاب پیدا ہوتا ہے۔ سنجیدگی تو خیر آپ میں پہلے بھی تھی مگر اب تو خدا کے فضل سے "فہمیدگی" بھی پیدا ہو گئی ہو گی۔ مگر ازدواجی زندگی میں آپ کے اس پہلے ہی قدم پر ایک آزمودہ کار کی

حیثیت سے چند گُر کی باتیں اس شادی کے تحفے کے طور پر پیش کرنا چاہتا ہوں۔

آپ کو تو یہ پہلا سابقہ ہے مگر میرے متعلق تو آپ کو یہ معلوم ہی ہوگا کہ ؎

عمر گذری ہے اسی دشت کی سیاحی میں

لہٰذا میری یہ باتیں گرہ میں باندھ لیجئے کہ آپ ٹھہرے تنقید نگار اور معاف کیجئے گا تنقید نگار اتنا حسن شناس نہیں ہوتا جتنا "عیب جو" ہوتا ہے۔ وہ بال کی کھال اس لئے نہیں نکالتا کہ اس میں خود اپنی صناعی کا کوئی جوہر دکھا سکے بلکہ مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ اس تجزیہ سے صنعتی لغزشوں کو اُجاگر کرے۔ اگر آپ نے خدانخواستہ یہ تنقید نگاری گھر میں بھی شروع کر دی تو دو ہی نتائج پیدا ہو سکتے ہیں کہ یا تو وہ آپ کو تنقید نگار سمجھ کر مرفوع القلم سمجھ لیں اور آپ کی بات پر برا ماننا چھوڑ دیں یا وہ آپ کی تنقید کی تاب نہ لا کر کہہ اُٹھیں کہ ؎

نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے

کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

شریکِ حیات تنقید نہیں قصیدہ چاہتی ہے خواہ وہ کتنا ہی بھونڈا کیوں نہ ہو۔ آپ کا فرضِ اوّلیں یہ ہے کہ آپ ان کو اپنے تنقید نگار نہ ہونے کا یقین دلادیں اور اُن سے کہہ دیجئے کہ یہ تنقید نگاری وغیرہ سب دُکان کی چیزیں ہیں ان کا گھر سے کوئی تعلق نہیں لہٰذا ؎

نہ کہیو طعن سے پھر تم کہ ہم ستمگر ہیں

مجھے تو خو ہے کہ جو کچھ کہو بجا کہیئے

اس شعر کے اصل معنی پر نہ جائیے بلکہ پہلے مصرعے کے "ہم" کو اُن کا نہیں بلکہ اپنا "ہم" بنا کر اس کا مفہوم اپنے سانچے میں ڈھال لیجئے۔ ازدواجی زندگی میں تعلیم نسواں کے فروغ کے بعد یہ انقلاب پیدا ہو چکا ہے کہ پہلے عورت ناقص العقل ہونے پر قانع رہتی تھی اور اب اس کو اُس وقت تک چین نہیں آتا جب تک شوہر کا فاترالعقل ہونا طے نہ پا جائے چنانچہ کامیاب شوہر وہی سمجھے جاتے ہیں جو فدویانہ زندگی بسر کرنا شروع کر دیں۔ بظاہر تو عورت مساوات کی علمبردار ہے لیکن اگر آپ مساوات برتنے کا یہ طریقہ اختیار کر لیں کہ ؎

عشق اگر حسن کے جلووں کا ہے مرہونِ کرم
حسن بھی عشق کے احساں سے سبکدوش نہیں

تو ازدواجی زندگی اچھی خاصی "تُو تُو مَیں مَیں" بن کر رہ جاتی ہے۔ وہ جو ہمارے آپ کے بزرگ اہلِ خانہ کے مجازی خدا بن کر شریکِ حیات کو حقیقی بندی سمجھ لیا کرتے تھے وہ زمانہ ان کے ساتھ ہی رخصت ہو گیا۔ اور وہ زمانہ بھی گیا جب شادی کے موقع پر آرسی مصحف کی رسم کے وقت ڈومنیاں دولہا سے کہلوایا کرتی تھیں کہ "کھو میاں، بیوی آنکھیں کھولو، میں تمھارا غلام ہوں" اب تو بیوی آنکھیں کھول کر پہلے یہ دیکھ لیتی ہے کہ یہ شخص غلام ہے یا نہیں اس کے بعد شادی کی نوبت آتی ہے۔ قصہ مختصر اگر آپ نے شادی کر ہی لی ہے تو ازدواجی زندگی کے آداب بھی جلد سے جلد حاصل کر لیجئے یہ تنقید نگاری۔ بے خودی اور خودستائی

ان سب کو مہرِ معجل کی شکل میں پہلے ادا کر دیجئے اور اگر تجربہ ہی کرنا ہے تو یہ امتحان بھی سہی ؎

دیکھئے کیا شور اُٹھتا ہے حریمِ ناز سے
سامنے آئینہ رکھ کر خود کو اک سجدہ کریں

مگر میں آپ کو مشورہ نہ دونگا کہ خود کو اس خواہ مخواہ کی آزمائش میں ڈالیں۔ عافیت اسی میں ہے کہ مونچھ نیچی ہی سہی۔ آپ کی اس نئی زندگی کی کامرانیوں کیلئے دست بدعا ہوں اور دولہا دلہن کا جام صحت ایک تازہ گلوری سے تجویز کرتا ہوں۔

شوکت تھانوی

پروفیسر وقار عظیم کے نام

گڑھی شاہو - لاہور

سیدی!

آپ کو جب پہلی مرتبہ پانوں کی جستجو میں پایا
تو سخت حیرت ہوئی کہ آپ کا بھلا اس "برگِ شجرِ ممنوعہ" سے کیا تعلق۔ پھر خیال
آیا کہ دوا کھانے کے بعد مریضوں کو منہ کا مزہ بدلنے کے لئے پان دے دیا
جاتا ہے شاید اسی قسم کی کوئی ضرورت پیش آ گئی ہو۔ مگر جب دوسری مرتبہ آپ کے
ہاتھ میں تو ام کی تشتی دیکھی تو بیساختہ یہ عرض کرنے کو جی چاہا کہ ـــ

آج تو آپ کو بھی جام بکف پاتا ہوں
حضرتِ شیخ میں آداب بجا لاتا ہوں

مگر حیرت تھی کہ اگر آپ یہ شغل فرماتے ہیں تو رنگ چہرہ کھا کیوں نہیں آتا اور یہ شغل نہیں تو سے

میکدے میں حضرتِ زاہد خدا کی شان ہے
جنت الفردوس کے دھوکے میں شاید آگئے

تحقیقات کی تو پتہ چلا کہ اس گرچہ میں حضور "بکار سرکار" آتے ہیں۔ جو جس قدر پان سے بیگانہ ہیں اُسی قدر گھر میں پاندان کا خرچ بڑھا ہوا ہے۔ کوئی اور ہوتا تو آپ اُس کو سمجھاتے۔ یہ بیکاری کی عادت چھوڑانے۔ مگر سے

دہن یار کا دیکھ چپ لگ گئی
سخن یاں ہوا ختم حاصل کلام

بہرحال کسی طرح سہی آپ کے گھر میں پاندان ہے تو موجود اور صرف موجود ہی نہیں ہے آباد بھی ہے ورنہ آپ کا بس چلتا تو آپ اپنے گھر کے ہر فرد کے منہ میں صابن کی ایک ایک فیکٹری کھول چکے ہوتے آپ تو ان بزرگوں میں سے ہیں جو پان کی اس ہردلعزیزی پر حیران ہوتے ہیں اور جن کی سمجھ میں یہ بات کسی طرح نہیں آتی کہ پان میں آخر دھرا ہی کیا ہے سے

معلوم نہیں کیا ہے لبِ سُرخ بتاں میں
اس آتشِ خاموش کا ہے شور جہاں میں

کبھی کبھی تو خیر آپ نے بھی پان کھایا ہی ہوگا۔ دوا پی کر۔ عید بقرعید کے موقع پر۔

کسی شادی بیاہ کی محفل میں مگر بغیر تمباکو کے در اصل پان پان ہی کب ہوتا ہے
اور تمباکو کھانے کا مشورہ آپ کے ایسے دھان پان کو دیا نہیں جا سکتا البتہ اتنا
ضرور عرض کرنا ہے کہ یہ پان سے بیگانہ رہنے ہی کا سبب ہے کہ آپ کا
ایسا ادب کا صحیح ذوق اور شعر کا صحیح وجدان رکھنے والا شعر و ادب کی ہمہ
رنگینی میں ڈوبنے کی پوری صلاحیت رکھنے والا نہایت ٹھوس اور ٹھس قسم کا
نقّاد اور ادب کا مؤرخ بن کر رہ گیا۔ آپ کی ادبی خدمات سے انکار نہیں
پھر بھی واقعہ ہے کہ آپ نے ادب کو بہت کچھ دیا ہے مگر معلوم نہیں کیوں جی یہ
چاہتا تھا کہ آپ نقّاد ہونے کے بجائے کچھ اور ہوتے۔ کچھ اور سے میری مراد
یہ ہے کہ صیاد نہ ہوتے بلکہ صید ہوتے۔ آپ کی فطری ذہانت، آپ کی متانت
کی اوٹ کے اندر بذلہ سنجی اور طنز و مزاح کی چھپی ہوئی آمد اگر بروئے کار آ سکتی
تو ادب کو اُس سے بہت زیادہ حاصل ہو سکتا جو آپ کی ٹھوس اور خشک
تحریروں نے عطا کیا ہے اس میں شک نہیں کہ اس خشک اور ٹھوس طرزِ تحریر
میں بھی کہیں کہیں آپ کی فطری بذلہ سنجی جھلک ہی جاتی ہے ؎

اگرچہ خشک ہیں جیسے پر کاہ
اُڑے ہیں میرجی لیکن ہوا میں

لیکن در اصل آپ کے اسی فطری رنگ کو نمایاں ہونا چاہیئے تھا جو آپ کی
تحریروں میں کم اور آپ کی گفتگو میں زیادہ نمایاں ہے مگر جس رفتار سے صحت

خراب ہو رہی ہے۔ درس و تدریس کی ملازمانہ ذمہ داریاں بڑھ رہی ہیں اور اپنے ارباب ثلاثہ میں خود اپنے روح القدس ہونے کا احساس پیدا ہوتا جاتا ہے اسی رفتار سے یہ بیساختگی مفلوج ہوتی جارہی ہے اور آپ وقار عظیم کے بجائے اپنے کو وہ وقار بناتے چلے جا رہے ہیں۔ کاش ان حالات نے اردو کو ایک نہایت بیساختہ قسم کے طنز نگار سے محروم نہ کیا ہوتا۔

میں نے ایک از ارباب ثلاثہ ڈاکٹر عبادت بریلوی کے مکتوب میں عرض کیا ہے کہ تنقید نگار اتنا حسن شناس نہیں ہوتا جتنا عیب جو ہوتا ہے مگر حیرت آپ پر ہے اس لئے کہ آپ فطرتاً حسن شناش ہیں۔ ہر حسین منظر آپ کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا کر دیتا ہے آپ کی روح جھوم جاتی ہے آپ کا دل خوش ہو جاتا ہے مگر اس کے بعد ہی جب آپ کی تنقید نگاری آپ کو آواز دیتی ہے کہ "یہ کیا ہو رہا ہے" تو آپ فوراً اپنے کو سنبھال لیتے ہیں اور اس حسن میں خامیوں کی جستجو شروع کر دیتے ہیں تاکہ حقِ تنقید ادا ہو سکے۔ معاف کیجئے گا اگر میں یہ عرض کردوں کہ ایک تنقید نگار جس فن پر تنقید کرتا ہے اس فن کا اس سے بہتر تو کیا اس سے کمتر قسم کا بھی کوئی نمونہ پیش کرنے کی جرأت کبھی نہیں کر سکتا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس میں صلاحیت ہی نہیں ہوتی۔ صلاحیت ہو یا نہ ہو مگر تنقید نگاری خود اس کو بزدل بنا دیتی ہے۔ تخلیق اور دریافت کا درجہ بہرحال تنقید سے بلند ہے اور حیرت ہے کہ آپ نے اس بلند مقام کو چھوڑ کر

اپنے کو خواہ مخواہ نقّاد کیوں بنا رکھا ہے۔

معاف کیجئے گا بات کچھ زیادہ بڑھ گئی۔ کہنا صرف یہ چاہتا تھا کہ مجھ کو آپ میں شوخی اور ظرافت کی جو روح نظر آئی ہے آپ اُس کا گلا گھونٹنے میں مصروف ہیں کاش آپ اس خونِ ناحق سے باز آجاتے۔ خیر چھوڑیئے اس ذکر کو آپ کسی اور کے لئے پان لائیے میں خود اپنے لئے پان بناتا ہوں۔

شوکت تھانوی

کرنل شفیق الرحمٰن کے نام

گڑھی شاہو - لاہور

شفیقِ مکرم!

آپ کا تصوّر پیدا کرنے کے لئے عجیب اجتماعِ
متضادین محدودِ تخیّل کرنا پڑتا ہے۔ ادب اور فوج، تھرمامیٹر اور وردی، ذوقِ
سلیم اور کورٹ مارشل، مزاجِ لطیف اور کوئک مارچ۔ اور مجھے کچھ ایسا محسوس
ہوتا ہے کہ گویا ایک میز پر قلم ریڈیو اور تھرمامیٹر تین مختلف چیزیں رکھی ہوئی
ہیں ان تینوں کو اگر طبِ یونانی کے ماہروں کی اصطلاح میں "سائیدہ حل کردہ"
کی کیفیات سے گزارا جائے تو یہ تینوں مل کر ایک شفیق الرحمٰن پیدا کر دینگی
اور پھر میں اُس شفیق الرحمٰن سے پوچھوں گا کہ ؎

تم اہلِ صفا۔ اہلِ رضا۔ اہلِ دعا ہو
سب کے لئے سب کچھ سہی میرے لئے کیا ہو

مجھے آپ سے ایک تعلقِ خاطر ضرور ہے مگر اسی کے ساتھ یہ بھی سن لیجئے
کہ میرا دل نہ تو چھاؤنی ہے کہ اس میں آپ وردی پہن کر قواعد کرتے پھریں، نہ
یہ کوئی فوجی اسپتال ہے کہ اس میں جناب والا میرے ارمانوں کو "رنگروٹ" سمجھ کر
ان کا بلڈ پریشر دیکھتے رہیں میرے دل میں صرف اس شفیق الرحمٰن کی جگہ ہے
جو اردو کا بڑا ہی پیارا صاحبِ طرز انشا پرداز ہے اور یہ بھی سن لیجئے کہ باوجود
اس تعلقِ خاطر کے ہیں یہ کہنے کو تیار نہیں کہ ؎

قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو
کاشکے تم مرے لئے ہوتے

میں قہر یا بلا سب کچھ سمیٹنے کو ہرگز تیار نہیں مجھ کو شفیق الرحمٰن ادب صرف
اردو ادب میں نمایاں ہونے والا شفیق الرحمٰن درکار ہے ؎

وہ چیز جس کے لئے ہم کو ہو بہشت عزیز
سوائے بادۂ گلفام مشکبو کیا ہے

بادۂ گلفام و مشکبو کی جگہ اگر اینڈ رنا رم کی بدبو اور بارود کی بو بہشت میں ہو
تو اس بہشت کے متعلق غالب کی طرح مجھ کو بھی کہنا پڑے گا کہ ؎

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

مجھے اس سے انکار نہیں کہ انسان اپنی ایک زندگی کے اندر کتنی ہی مختلف زندگیاں بسر کرتا ہے اور اس ایک ہی زندگی کے مختلف مرقعے ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہوتے ہیں کہ ان کے تمام رنگ روغن اور تمام خطوط اور نقوش میں ایک کا دوسرے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا مگر ان ہی مختلف مرقعوں میں سے ایک مرقع وہ بھی ہوتا ہے جسے وہ اپنا ذاتی اور نجی مرقع کہتا ہے۔ آپ کا وہ نجی مرقع آپ کی ادبی حیثیت ہے جو نہ آپ کا عہدہ ہے نہ آپ کا روزگار اور مجھے اسی سے سروکار ہے۔ میرے لئے آپ کے اسی مرقع نے آپ میں ایک کشش پیدا کی چنانچہ جب میں سب سے پہلے آپ سے راولپنڈی میں ملا ہوں اس وقت آپ میں جو یکرنگی اور ہم آہنگی اپنے لئے میں نے پائی اسکی وجہ صرف یہ تھی کہ آپ وردی میں نہ تھے۔ آپ سر جنوں والی کلغی پہنے ہوئے نہ تھے بلکہ ایک عام قسم کا سوٹ پہنے ایک ایسی محفلِ شعر و ادب میں تھے جہاں آپ پان بھی کھا رہے تھے۔ ہنس بھی رہے تھے۔ ہنسا بھی رہے تھے اور نہایت شگفتہ باتیں بھی کہہ رہے تھے۔ اگر خدانخواستہ میں نے آپ کو کرنیلی کی وردی میں دیکھا ہوتا تو بھی کہتا تو یہی کہ ؎

بہ ہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش

من اندازِ قدت را می شناسم

مگر اس شناسائی سے طبیعت خوش نہ ہوتی۔ سب سے زیادہ خوشی تو مجھے اس

بات سے ہوئی کہ یہ ولایت سے باز آنے والا پان کھانے سے باز نہیں آیا۔ ہر چند کہ آپ کے پان کھانے میں ایک اناڑی پن تھا جو ہونا بھی چاہیے تھا اس لئے کہ آپ پان ضرورتاً نہیں غالباً تفریحاً ہی کھاتے ہیں مگر آپ کے اس پان کھانے کی سادگی میں بلا کی پرکاری تھی۔ اس اجتماع میں بہت سے "چیونگ گم" کھانے والے پسماندگانِ فرنگ بھی تھے مگر ان سب سے ایک مغائرت ہی رہی ہر چند کہ وہ محفل مغائرت کے لئے نہ تھی بلکہ اس اجتماعِ خصوصی کو محفل سے زیادہ حمام کہنے کو جی چاہتا ہے مگر اس بے تکلفی کے باوجود چونکہ ایک ہی رنگ میں سب لے اپنے کو نہ رنگا لہٰذا لاکھ بے پردگی کے باوجود بہت سے پردے پڑے رہے۔ غضب خدا کا وہ محفل جو مخصوص ہو رفیع احمد خاں مرحوم سے اظہارِ عقیدت کے لئے اس میں ایسے "بھوبھیٹیوں" کی قسم کے لوگ بھی موجود ہوں جن کا ایک ایک انداز یہ کہہ رہا ہو کہ ؎

کرتا ہے بسکہ باغ میں تو بے حجابیاں
آنے لگی ہے نکہتِ گل سے حیا مجھے

قصہ مختصر جی چاہتا تھا کہ اس حریمِ ناز سے آپ کو مناں کہ اور اُن محرموں کو جو یہاں نامحرم بنے بیٹھے ہیں لیکر نکل جائیں۔ اس کے بعد جب کبھی اور جہاں کہیں آپ سے ملاقات ہوئی آپ سے مل کر وہی لطف آیا جو آپ کو پڑھ کر آتا ہے آپ کی ایک ہی زندگی میں خواہ کتنی ہی مختلف زندگیاں کیوں نہ ہوں مگر

آپ کی مجلسی گفتگو اور ادبی تحریروں میں عجیب یکرنگی ہے اور میرا مطالعہ یہ ہے کہ آپ کے یہاں جو دل میں ہے وہی زبان پر ہے اور جو زبان پر ہے وہی کاغذ پر بھی آتا ہے۔ آپ کی تحریروں کے خلوص کی وجہ صرف یہی ہے کہ آپ میں ادبی دیانت غیر ارادی طور پر موجود ہے اور یہی آپ کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے۔

آیئے راولپنڈی کی اُن مجلسوں کی یاد میں ایک بزمِ تصور آراستہ کریں۔ آپ کو بٹھائیں۔ پان بنائیں اور رفیع احمد خاں کو یاد کریں۔

شوکت تھانوی

میجر منّان اللہ بیگ کے نام

گڑھی شاہو - لاہور

محبِ مکرم!

لکھنؤ میں ایک محلّہ ہے جس کا نام ہے ماموں بھانجے کی قبر چنانچہ اس محلّے میں دو قبریں برابر برابر بنی ہوئی ہیں اور کچھ پتہ نہیں چلتا کہ ان قبروں میں سے کونسی قبر ماموں ہے اور کونسی بھانجہ۔ لکھنوی ہونے کی رعایت سے آپ نے بھی راولپنڈی میں سکونت اختیار کی تو کہاں "ماموں جی روڈ" پر ؎

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

لکھنؤ والی ماموں بھانجے کی قبر کے متعلق روایت یہ مشہور ہے کہ یہ دونوں

ماموں بھانجے ایک دوسرے سے بہت دور تھے مگر فاصلہ قلبی تعلق کو دور نہ رکھ سکا اور ہر چند کہ ایک نے دوسرے کو کبھی دیکھا بھی نہ تھا مگر یہ ماموں بھانجے ایک دوسرے کے عاشق زار تھے چنانچہ دونوں کی وصیت یہ تھی کہ اگر زندگی میں کبھی ایک دوسرے سے نہ مل سکیں تو مرنے کے بعد ہی دونوں یکجا کر دیئے جائیں چنانچہ یہی ہوا ؂

تباہیوں نے امانت کی طرح پہنچا دی
ہماری خاک لحد تھی جہاں جہاں کے لئے

مگر آپ غالباً اس سڑک پر اتفاقاً ہی رہ پڑے ہیں اور خواہ مخواہ ہی بھلے بنے ہوئے ہیں اور اب ضد یہ ہے کہ ع

بیٹھے ہیں رہ گذر پہ ہم کوئی ہمیں اٹھائے کیوں

آپ کا یہی گھر بڑے بڑے "تاریخی رومانوں کی آماجگاہ رہ چکا ہے۔ مرزا غالب دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنی رفعتوں سے بہت اترے تو زیادہ سے زیادہ ایک ستم پیشہ ڈومنی تک پہنچے تھے مگر اس گھر میں دلوں پر جھاڑو پھرتے بھی دیکھی گئی ہے اور اس گرد و غبار سے بجائے گھبرانے کے آپ کے بڑے بڑے ادیب اور شاعر مہمانوں نے بڑے بڑے عبادت گذار دوستوں نے ادب کے بڑے بڑے ماہروں نے اور شعر کے بڑے بڑے قادروں نے بھی کہا ہے کہ ؂

خاکسارانِ جہاں را بحقارت منگر
تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

اور آخر کار یہی طے پایا تھا کہ نہ تو چاند پر خاک اچھالنے سے کچھ ہوتا ہے اور نہ خود چاند کے خاک اچھالنے سے، سوائے اس کے کچھ ہو سکتا ہے کہ چاند کی اچھالی ہوئی خاک کو بھی چاندنی کہہ کر قبول کر لیا جائے۔ بات دراصل یہ ہے کہ حسن کسی طبقے کی اجارہ داری میں نہیں آتا۔ چاند صرف ایوانوں ہی پر نہیں جھونپڑیوں پر بھی چمکتا ہے۔ جوانی صرف رانی پر نہیں مہترانی پر بھی آتی ہے ؎

مہترانی ہو کہ رانی گنگنائے گی ضرور

چاند ستاروں کے ذکر پر ذہن نے یہ بات بھی سجھائی کہ ستاروں میں سے ایک ستارے کا نام "جھاڑو ستارہ" بھی ہے۔ کہکشاں کو "گردِ فلک" بھی کہتے ہیں اور قمر سے بدر بنتے بنتے چاند کی ایک صورت وہ بھی ہوتی ہے جب وہ ڈکراسا نظر آتا ہے۔ خیر ان رعایتوں کے ڈھونڈھنے کی ضرورت ہی کیا ہے اُن سے پوچھیے جو آپ کے گھر مہمان رہ چکے ہیں اور اس چاند پر اپنی حریص نگاہوں کی خاک اچھال چکے ہیں۔ میں نے خود ایک زاہد شب بیدار کو اس حسن سے خدا کی پناہ مانگتے ہوئے دیکھا ہے بار بار نگاہیں بھٹکتے اور پھر توبہ کرتے دیکھا ہے اور جوش کا یہ شعر تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ مجھ کو آپ کے یہاں نظر آچکا ہے کہ ؎

جھاڑ دی اس کو دیکھ کے سینے پہ پھر گئی
اک شیخ کے تو ہاتھ سے تسبیح گر گئی

مگر یہ صرف ایک فصلِ گل کا ذکر ہے دوسری مرتبہ نہ وہ بہار نظر آئی نہ ویسا کوئی پھول کھلا دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ؎

خدا جانے کس کی نظر کھا گئی

اس کی جگہ ایک سوکھی سہمی جلی جھلسی سی ایک چیز نظر آئی ؎

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی

ایک عجیب بیہودہ سی چیز دکھائی دی اور اس کو دیکھ کر کہنا پڑا کہ ؎

چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک

خیر آپ کو ایک عجیب قسم کی اداکاری سے نجات مل گئی۔ اللہ اکبر کس قدر لئے دیئے رہنا پڑتا تھا آپ کو۔ کیسا کیسا رعب چہرے پر پیدا کرتے تھے جس کو صرف ایک نگاہِ غلط انداز اُٹھ کر کہہ دیا کرتی تھی کہ یہ "رعب ہے؟" "خاک رعب ہے" اس خاک رعب کو "خاکرِ دب" نہ پڑھ جائیے گا چھوڑیئے اس ذکر کو ممکن ہے کہ آپ کا دل کہہ رہا ہو کہ ؎

کیوں یاد دلاتے ہو بھولا ہوا افسانہ

اُٹھیے اور وہ پاندان اُٹھا لائیے جس سے کبھی کبھی آپ بھی پان اس طرح کھا لیتے ہیں جیسے کوئی خون لگا کر شہیدوں میں داخل ہو جائے کاش آپ اس

پاندان کی قدر کرسکتے جس میں آج بھی تمام لکھنوی تکلفات موجود نظر آتے ہیں سوائے اُس پان کے جو یہاں ملتا ہی نہیں۔ خیر برات تو ہے سب دولہا کی سہی۔ آپ اسی پاندان سے ایک بنا کر کھا لیجیے میں اپنے پاندان کی طرف دستِ طلب بڑھاتا ہوں۔

شوکت تھانوی

میر عزّت حسین کے نام

گڑھی شاہو۔ لاہور

محبِّ مکرم!

جو کوئی آپ سے نہیں ملا ہے وہ کیا سمجھ سکتا ہے
کہ آپ کیا ہیں۔ ہیں تو آپ کے متعلق اکثر احباب سے کہا کرتا ہوں کہ ؎

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

بلکہ یہ بھی واقعہ ہے کہ جو آپ سے مل چکے ہیں اُن میں سے بھی یہ بات ہر ایک
کو نہ معلوم ہو گی کہ بقول غالبؔ ہر آدمی بجائے خود محشرِ خیال ہو یا نہ ہو مگر آپ
ضرور ہیں اور جو باتیں آپ کو سوجھتی رہتی ہیں کیا کسی کو سوجھ سکتی ہیں۔ غالبؔ

کے اسی شعر کا دوسرا مصرعہ تو آپ کی اس بزم خصوصی پر من وعن صادق آتا ہے جس کے متعلق سوائے مقربین خاص کے کسی کو نہیں معلوم کہ اس حلقۂ خصوصی میں کیا ہوتا ہے البتہ اس خلوت کے انجمن ہونے کا سب کو علم ہے۔

ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

اس حلقۂ خاص کے آشنائے راز صرف وہی ہیں جو حلقے میں شامل ہیں اور جو اس حلقے کے باہر ہیں وہ زیادہ سے زیادہ یہی کہہ کر رہ جاتے ہیں کہ ؎

اک آفتِ زماں ہے یہ میرؔ عشق پیشہ

پردے میں سارے مطلب اپنے ادا کرے ہے

مگر ہم یہ تو جانتے ہیں کہ آپ کی جلوت بھی آپ کی اس خلوت سے کچھ کم معمّہ نہیں ہے بلکہ آپ کی ساری زندگی اور زندگی کا ہر اسلوب کچھ عجیب پراسرار سا ہے عمر کا بیشتر حصّہ کچھ اس انداز سے گذرا کہ خود ایک چلتی پھرتی انجمن بنے رہے مگر ذاتی طور پر بے خانماں ؎

عشق کا گھر ہے میرؔ سے آباد

ایسے پھر خانماں خراب کہاں

دل کی بیماری ضرور ہوئی مگر اس بیماری کو پال کر کبھی نہ بیٹھے۔ اس بیماری کے لئے " علاج بالمثل " طبیعت کو موافق آیا " علاج بالضد " سے طبیعت نے میل نہ کھایا نہایت معصومیت کے ساتھ اپنے اس مشرب کے جواز کے قائل

رہے اور اس سادگی سے اس پرکاری کو جاری رکھا کہ میر تقی میر کی روح بھی جھوم اٹھی ؎

میر کی عیاریاں معلوم لڑکوں کو نہیں
کرتے ہیں کیا کیا ادائیں اس کو سادا سا سمجھ

آخرکار آپ انسان ہی ہیں بھول چوک ہو ہی جاتی ہے کچھ عمر کا تقاضا کچھ حالات کا مطالبہ تقسیم ملک کے بعد اپنے مشاغل کے ساتھ ساتھ یہ بھی دھڑکا لگا رہا کہ ؎

اس عہد کو نہ جانئے اگلا سا عہد میر
وہ دور اب نہیں وہ زمیں آسماں نہیں

چنانچہ طے کیا کہ ہاتھی کے کھانے کے دانت تو خیر ہیں ہی دکھانے کے بھی ہو جانے تو اچھا تھا چنانچہ زندگی کا نہ جانے وہ کونسا گزرا لمحہ تھا جو آپ کو شادی کر لینے پر رضامند کر گیا اور اب عالم یہ ہو گیا کہ ؎

دل اور عرش دونوں پہ گویا ہے ان کی سیر
کرتے ہیں باتیں میر جی کس کس مقام کی

مگر بہت ہی جلد اس دورنگی سے طبیعت اچاٹ ہو گئی اور کانوں پر ہاتھ جانے لگے۔ نیازمندانِ خاص نے تو اسی وقت کہہ دیا تھا کہ یہ توبہ وقتی ہے یہ استغفار موسمی ہے ؎

کہتے ہو کا پیتا ہوں جوں ببیدِ عاشقی سے
تم بھی تو میر صاحب کتنے خلاف گو ہو

نتیجہ یہ کہ زندگی کی اس رد و عمل سے کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا مزاج کی وارفتگی نے اپنے ذوق سے بھی کنارہ نہ کرنے دیا اور طبیعت کی رواداری نے اُس زبردستی کو بھی اپنائے رکھا جو اب گلے کا پھندا ثابت ہو رہی تھی۔ عمر بڑھتی گئی اعتبار فزوں ہوتا رہا اور صورتِ حال آخر یہ ہو گئی کہ ـــــ

ہے میر پیر لیک سوئے میکدہ مدام
جاتا ہے مغبچوں کی ارادت کے واسطے

یہ سلسلہ تو جاری رہتا ہی ہے۔ چور اگر چوری سے جاتا بھی ہے تو ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔ مگر مجھ کو تو آپ کے اُس ذوقِ صحیح سے عقیدت ہے جو آپ پانوں کے سلسلے میں بروئے کار لاتے رہتے ہیں۔ پان سے عشق کی یہ انتہا نہیں تو اور کیا ہے کہ پانی کی طرح پانوں کی فی سبیل اللہ ایک سبیل کھول رکھی ہے جس پر پان فروخت کم ہوتے ہیں پان کا صحیح ذوق رکھنے والوں کی سیرابی کا کام زیادہ دیتے ہیں۔ احسان فراموشی ہوگی اگر میں یہ عرض نہ کروں کہ کبھی کبھی تو آپ ان حالات میں عجیب الطرفین پان کھلا دیتے ہیں جب پان کا مزہ بھی تقریباً بھولی بسری بات بن کر رہ جاتا ہے۔ سوکھے دھانوں پانی پڑنے کا محاورہ تو پرانی بات ہے مگر آپ کے طفیل سوکھے لبوں پان پڑنے

کا محاورہ بھی عملی صورت اختیار کرتے دیکھ لیا۔ سو باتوں کی ایک بات یہ کہ آپ کے حلق سے پان اُترتا ہی نہیں سکتا جب تک کہ دوسرے تشنہ لبوں کو بھی آپ سیراب نہ کر دیں۔ آپ کی یہی ایک خوش اعمالی آپکے نامۂ اعمال کی شب دیجور پر آفتاب بن کر چمکنے کے لئے کافی ہے اور دیکھ لیجئے گا کہ قیامت کے دن یہی پان جو آپ دوسروں کو کھلاتے ہیں آپ کی سرخروئی کا سبب بنیں گے۔

شوکت تھانوی

مولانا عبدالمجید سالک کے نام

گڑھی شاہو۔ لاہور

آقائی و مولائی

اگر "للّٰہی بغض" کوئی چیز ہے تو "للّٰہی حُب" کے وجود سے بھی انکار نہیں ہو سکتا ہم کو بعض افراد سے خواہ مخواہ کا تنفر سا ہوتا ہے خواہ اس نفرت کی کوئی وجہ ہو یا نہ ہو بس ان کی صورت دیکھی اور طبیعت میں اشتعال پیدا ہوا۔ اسی طرح بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کی طرف خواہ مخواہ دل کھنچتا ہے۔ میرے لئے آپ کی شخصیت کچھ اسی قسم کی ہے۔ اب سے چھبیس۔ ستائیس برس پہلے جب میں لکھنؤ کے روزنامۂ ہمدم کا مدیر معاون اور پھر مدیر تھا ہمدم کے معاصرین میں سے صرف انقلاب ہی

ایک ایسا روزنامہ تھا جس کو میں نے اپنے لئے مشعلِ راہ سمجھا اور اگر سچ پوچھئے تو اس کا بہرہ "حوادث و افکار" ہی تھا جس نے مجھ سے مزاح لکھوایا۔ ہمدم کا مزاحیہ کالم "دو دو باتیں" میری مزاح نگاری کا گھٹنیوں چلنے والا بچپن تھا۔ اُسی زمانے میں مجھ کو لاہور آنے کی تمنّا صرف اس لئے تھی کہ میں آپ سے ملوں چنانچہ لاہور پہنچتے ہی آپ سے ملا اور غائبانہ عقیدت نے گرویدگی کی صورت اختیار کر لی۔ یہ اُس زمانے کا ذکر ہے جب لاہور میں پان کھانے کو خالص "یو پیا پن" سمجھا جاتا تھا مگر اس زمانے میں بھی آپ کی شیروانی کی جیب سے پانوں کی ڈبیا طلوع ہوئی ؎

شفق نے پھول بکھیرے خزاں کی وادی میں
سحر نے دامنِ مشرق کو لالہ زار کیا

ایک چھوٹی سی چاندی کی ڈبیا میں دانہ دار تمبا کو دیکھ کر میں تو حیران رہ گیا کہ یہاں بھی اس سلیقہ اور اس نفاست کے ساتھ پان کھانے والے موجود ہیں اور پھر مجھ کو یہ مسرت ہوئی کہ کھیلا تو تھا اندھا جوا مگر جیت اپنی ہی رہی فرض کیجئے پان کے معاملے میں سالک صاحب بھی "یو پین" نہیں بلکہ "یوروپین" نکلتے تو میں کیا کر لیتا۔ مگر اس معاملہ میں بھی آپ کو اپنا ہم مشرب پا کر معلوم ہوا کہ منہ مانگی مراد مل گئی۔

مولانا آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ پان کے لئے منہ مانگی مراد کس قدر برجستہ آیا

ہے - خیر یہ تو بہت پُرانا قصّہ میں چھیڑ بیٹھا۔ اب وہ دن کہاں۔ وہ دَور کہاں وہ زمانہ کہاں - ماضی کی یہ یاد کب تک ؎

گزر رہا ہے جو اُس کارواں کی بات کرو

آخر کار تقسیمِ ملک نے اُسی لاہور کو وطن بنا دیا جہاں ۱۹۲۸ء میں صرف ایک مرتبہ آنے کی تمنا تھی اور یہ بھی عجیب اتفاق کہ لاہور آ کر مکان بھی آپ ہی کے محلّے میں ملا - اللہ جانے یہ آپ کی کشش تھی یا میری طلب کا خلوص - غالباً دونوں ہی کا اس میں ہاتھ تھا - بہرحال یہ قرب اور یہ اتصال عارضی اور وقتی سہی مگر تھا بہت غنیمت - پھر تو پاکستان بن جانے کے بعد محکمۂ بحالیات کے انتظامات نے یہ صورتِ حال پیدا کر دی کہ ؎

دشتِ جنوں میں ہو گئی منزلِ یار بے سراغ
قافلہ کس طرف گیا بانگِ درا کو کیا ہوا

مگر شکر ہے کہ صرف محلّہ ہی بدلا شہر نہیں بدلا اور تقویت کے لئے یہی غنیمت نظر آنے لگا کہ بہرحال آپ اسی شہر لاہور میں ہیں - حالانکہ فاصلے نے صورت یہ پیدا کر دی کہ ؎

میسّر جس سے آ جاتی تھی ساقی کی قدم بوسی
مقدّر میں نہیں وہ لغزشِ مستانہ برسوں سے

یہ لغزشِ مستانہ ہی تو تھی کہ ہنجہ لی اسٹڈیو سے گھر چلے ہیں کہ آپ کی کوٹھی

کے سامنے پہنچکر قدم ڈگمگائے ۔ سمت بدلی اور پہنچ گئے آپ کے پاس گھر سے اسٹڈیو جاتے ہوئے آپ نظر آ گئے اور اسٹڈیو پہنچنا کچھ غیر ضروری سا نظر آنے لگا ۔ اب تو گڑھی شاہو سے مسلم ٹاؤن جانا ایک ایسا سفر معلوم ہوتا ہے جسے انگریزی کا SUFFER کہنا چاہیئے ۔ حالانکہ اب بھی کبھی کبھی بےساختہ جی چاہتا ہے کہ آپ کی خدمت میں حاضری دی جائے اور آپ سے پوچھا جائے کہ جس ناز و نعم سے آپ نے اپنے پان کھانے کے ذوق کو پروان چڑھایا تھا وہ ذوق آجکل کس عالم میں ہے ، یہ "پٹ سن نژاد" پان آپ سے کیسے کھائے جاتے ہوں گے اور انھیں کھا کر منہ میں رسیاں بٹنے کا کارخانہ آپ سے کیسے کھولا جاتا ہوگا ۔ میں نے تو خیر پان ہی ترک کر دیا ہے ۔ گٹکے پر گذر اوقات ہو رہی ہے ۔ اگر کبھی دیسی پان مل جاتا ہے تو اُسے چومتا ہوں ۔ آنکھوں سے لگاتا ہوں اور اس کی گلوری کھا کر اس طرح خوش ہوتا ہوں جس طرح عبید نفر عباد پان کھا کر جولاہے خوش ہوا کرتے تھے ۔ مگر جب یہ پان میسّر نہیں آتا تو بجائے اُس نام نہاد پان کے جو ملتا ہے میں "تیمم" کا قائل ہو جاتا ہوں اور اب اس گٹکے کی عادت سی پڑ گئی ہے ؎

عادت سی ہے نشہ ہے نہ اب کیف
پانی نہ پیا شراب پی لی

تو کیا آپ اب تک پان کھا رہے ہیں ۔ یعنی یہ کثیف پان ؟ کاش آجکل

آپ حوادث و افکار لکھ رہے ہوتے اور اس نام نہاد پان کو اپنا موضوع بنا کر اس کی قلعی کھولتے۔ حوادث و افکار پر یاد آیا کہ خدا کرے حوادث و افکار کو ایک مجموعہ کی صورت میں پیش کرنے کی ضرورت کا آپ کو بھی احساس پیدا ہو چکا ہو۔ کام آسان نہیں ہے ایک انبار ہوگا جس میں سے انتخاب کرنا پڑے گا مگر یہ کام ہو جانا چاہیئے یہ ایک بڑا قیمتی ادبی سرمایہ ہے جسے بہر حال محفوظ کر لینا چاہیئے۔ آپ کے حوادث و افکار کی یاد میں گلگلے کی ایک تازہ خوراک بنا کر کھاتا ہوں۔ آپ بھی پان کے بجائے جو دھوکہ آجکل کھا رہے ہوں کھا لیجئے۔

شوکت تھانوی

ساغر نظامی کے نام

گڑھی شاہو۔ لاہور

صدیقی و حبیبی!

ہماری عمر نہیں بلکہ ہمارے مراسم کی عمر تیس سال سے زیادہ ہو چکی۔ زندگی تو بے حیا تھی ہی دوستی اُس سے بھی زیادہ بے حیا نکلی مگر اس کے باوجود آخری ملاقات جون ۱۹۵۶ء میں جب دہلی میں ہوئی ہے تو آپ فرما رہے تھے کہ لاحول و لاقوہ ابھی ہم کہاں بوڑھے ہوئے اور یہ کہہ کر اُسی جوش و خروش کے ساتھ آپ نے اپنی سوٹ کیس نما ڈبیا سے پان کھایا تھا جس طرح لکھنؤ سٹی اسٹیشن پر گورکھپور جاتے ہوئے تلے اوپر تین چار گلوریاں کھا کر آپ نے میری مہمان نوازی کا صرف یہ شکریہ ادا کیا تھا کہ اگر

آپ کا مہمان نہ بنتا تو یہ شگفتہ پان کیسے میسر آتے جن میں شامِ اودھ کی شفق پھولتی ہے۔ ان پانوں میں شامِ اودھ کی شفق پھولتی ہو یا نہ پھولتی ہو مگر میں پھولا نہ سمایا تھا۔ بہرحال ثابت یہ ہوا کہ جب تک آپ میں پان کھانے کی یہ اُمنگ باقی ہے آپ اپنے کو بوڑھا نہیں سمجھ سکتے مگر میں کیا کروں مجھے تو پان بھی میسر نہیں اگر آپ کے حصّے میں بھی وہی پان آجائیں جو یہاں پان کہلاتے ہیں تو جوانی کا تو خیر ذکر ہی نہیں شاید آپ زندگی کے بھی قابل نہ رہیں۔

یہ پان وہ نہیں ہیں جن کے متعلق آپ یہ کہہ سکیں کہ ؎

پان اے عنوانِ رنگینِ لبِ لعلینِ یار
اے ذرا سے سبز پتّے غازۂ روئے بہار

بلکہ ان پانوں کے متعلق شاید آپ کو دوسرے ہی اسلوب سے نظم کہنا پڑے کہ ؎

پان اگر تو پان ہے تو تجھ پہ لعنت بار بار
اے بڑے سے سبز پتّے داغِ دامانِ بہار
لہلہایا مرچ کے کھیتوں میں تو پٹ سن نژاد
وہ تجھے کھائے جسے نانی بھی اپنی ہو نہ یاد
یہ جسامت یہ دبازت الحفیظ و الامان
اے مرے چھپر کے چھپر آہ میرے دھان پان"

سخت حیراں ہیں کہ ہم اوڑھیں بچھائیں کیا کریں
تو ہمیں کھائے گا یا ہم تجھ کو کھائیں کیا کریں

اس پان سے اُن پانوں کا تصوّر ہرگز نہ کیجیے جن کے بتیس پان کا ایک بیڑہ شادی بیاہ کے موقعوں پر دُولہا کو کھلایا جاتا تھا۔ اگر ان تبیس پانوں کا بیڑہ دولہا کو کھلا دیا جائے تو دُلہن کی مانگ شاید اسی وقت اُجڑ جائے۔ عرض تو کیا کہ آپ کے پان اور اس پان میں وہی فرق ہے جو آپ کے یہاں پان اور ڈھاک کے پتّوں میں نظر آتا ہے۔ آپ پان کھانے کے بعد اگالدان کی ضرورت محسوس کرتے ہیں اور ہم صرف اِس پان کو دیکھ کر اُگالدان میں پناہ لینا چاہتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ میں نے اس پان کو دُور ہی سے سات سلام کیے مجبوری کا نام صبر رکھ کر خشک گلے پر قناعت کی اگر کبھی وہ پان مل جاتا ہے جو اس بٹوارے میں آپ کو مل چکا ہے تو ایسی خوشی ہوتی ہے جیسے متروکہ جائداد مل گئی۔ اور اگر نہیں ملتا تو اپنا گُٹکا سلامت ہے۔ اگر آپ کو یقین نہ آتا ہو تو تشریف لائیے ہم آپ کی ان ہی پانوں سے تواضع کریں گے اور آپ انشاءاللہ اپنی ہی نظم کچھ اس طرح گڑبڑا کر پڑھیں گے کہ یہ بدحواسی بھی یادگار بن جائے۔ یہ پان کھا کر آپ یہ تصوّر نہیں کھینچ سکتے کہ ؎

زلفِ رُخ پہ پان کی مِسّی لبِ کافر پہ ہے
اک گھٹا کوثر پہ ہے اک ساحلِ کوثر پہ ہے

بلکہ یہ پان کھانے کے بعد آپ کو یقیناً یہی کہنا پڑے گا کہ ؎

زلف منہ میں پان کی مسّی دلِ مضطر میں ہے
یا الٰہی کھا گئے کیا عقل تک چکّر میں ہے

تماشہ یہ ہے کہ یہاں پان نہیں مگر پان کھانے والوں کی کثرت ہے۔ پنواڑیوں کی دوکانیں بے شمار ہیں۔ طرح طرح کے قوام بن رہے ہیں جن میں پسے ہوئے کوئلے کے قوام سے لیکر سچ مچ کے قوام تک سب ہی شامل ہیں صوفی غلام مصطفےٰ تبسم سے لیکر اقبال صفی پوری تک سب ہی قوام بنانے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ کوئی پوچھے ان سے کہ جب پان نہیں تو یہ قوام کیوں اور کس کے لئے ؎

پتہ نہیں کہیں ان کا اور ان کے دیوانے
تصوّرات کی محفل سجائے جاتے ہیں

اگر سچ پوچھیئے تو یہ سب پان کا غم غلط کرنے کے مشاغل ہیں اور ایک آپ ہیں کہ ولایت تک اپنا کلام سنانے جاتے ہیں تو پانوں کی کمی وہاں بھی محسوس نہیں ہوتی ان حالات میں آپ بھلا کیونکہ بوڑھے ہو سکتے ہیں رہ گئے دوسرے غم وہ آپ پالتے نہیں۔ اردو اگر ختم ہو رہی ہے تو آپ کی جوتی کی نوک سے آپ شاعری کی جگہ اپنے کو "کوئی" کہنے لگیں گے ساغر کی جگہ اپنے کو "کھر" تسلیم کرلیں گے۔ غزل کی مانگ نہ رہی تو گیت سہی نظمیں نہ سہی دوہے سہی بہر حال آپ میں اسکی پوری صلاحیت ہے کہ آپ اپنے کو بدلتے ہوئے حالات کے

سانچے میں ڈھال لیں اور آپ سے یہ ناممکن ہے کہ ان حالات سے گھبرا کر
اپنا ٹھکانہ کہیں اور ڈھونڈھیں۔ مگر کیا آپ نے یہ بھی سوچا ہے کہ آپ کی یہ
تمام وفاداریاں ہمیشہ مشکوک نگاہوں سے دیکھی جائیں گی آپ خلوص سے بھرپور
کلیجہ ہتھیلی پر لئے پھریں گے اور سمجھا یہی جائے گا کہ اس میں بھی کوئی کھوٹ نہ ہو۔
بہرحال نگہِ اعتبار میں جگہ پانے کے لئے آپ کو عجیب امتحانوں سے گذرنا پڑیگا
اور ہر قدم پر یہی گنگنانا پڑے گا کہ ؎

روح بلبل نے خزاں بن کے اجاڑا گلشن
پھول کہتے رہے ہم پھول ہیں صیّاد نہیں

مگر میں جانتا ہوں کہ اس عالم میں بھی آپ بے بھرم وفا کا بھرم ڈھونڈھنے سے
کبھی نہ تھکیں گے خدا آپ کو استقامت دے۔

شوکت تھانوی

اقبال صفی پوری کے نام

گڑھی شاہو۔ لاہور

عزیزی و حبیبی!

ابھی ایک صاحب تشریف لائے تھے اور
تحفہ کے طور پر قوام کی ایک شیشی لائے تھے۔ اپنے سامنے ہی مجھ کو یہ بیہودہ
قوام زبردستی کھلایا ؏

زہر دے اس پہ یہ تاکید کہ پینا ہو گا

جب میرا منہ جھنجھنا گیا۔ طبیعت لوٹ پوٹ ہو گئی۔ اور ابکائیاں ضبط
کرتے کرتے میں شل ہو گیا تو میں نے اُن سے کہا کہ "یہ کیا کہنا ہے صاحب
سبحان اللہ۔ زندگی میں پہلی مرتبہ ایسا قوام کھایا ہے" وہ حضرت میری اس

داد کو سند سمجھ کر تشریف لے گئے تو میں نے اپنے منہ کو اسی طرح صاف
کیا جس طرح طاعونی چوہا نکلنے کے بعد محکمۂ حفظانِ صحت سے گھر کی صفائی کرائی
جاتی ہے۔ نمک اور گرم پانی سے مسلسل کلیاں کیں۔ جی تو چاہتا تھا کہ ہائیڈروجن
پر ‌‌آکسائڈ سے غرغرہ کروں مگر جب وہ نہ ملی تو اسی نمکین پانی سے غرغرے
کرتا رہا اور بمشکل تمام اُس نامعقول قوام کی چکنائی صاف ہو سکی۔ آپ چکنائی پر
چونکئے نہیں وہ واقعی مرہم کی طرح چکنا قوام تھا جس میں چکٹے ہوئے تیل کی بدبو
بھی تھی اور مجھے یقین ہے کہ اس قوام کے اجزائے ترکیبی میں موبل آئل کی کھپت
ضرور ہو گی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرت نے اس قوام کو زیادہ سے زیادہ
معطر بنانے کے لئے کافی مقدار میں عطر ڈالا ہے اور چونکہ آجکل خود عطر میں
کافی مقدار تیل کی ہوتی ہے لہٰذا یہ قوام اچھی خاصی گریس بن کر رہ گیا۔ اب میں
نے یہ قوام کی شیشی ملازم کو دے دی ہے کہ اسے سائیکل کی چین پر لگا دے۔
اس بیہودہ قوام کے استعمال کے بعد آپ کا یاد آنا ضروری تھا اس کا مطلب
یہ نہیں ہے کہ آپ بے کیفیوں میں یاد آتے ہیں۔ وہ بے کیفیاں ہوں یا عالمِ
کیف آپ تو یاد آتے ہی رہتے ہیں ؎

کسی کی یاد کا عالم ارے معاذ اللہ
ہر ایک سانس پہ لو دے اٹھی ہے تنہائی

مگر اس موقع پر آپ خصوصیت سے اس لئے یاد آئے کہ قوام کے معاملے میں

احساس کو نازک بنانے میں آپ کا بڑا ہاتھ ہے نہ آپ قوام بناتے۔ نہ آپ اپنی نفاست طبع اور اپنے مزاج کے توازن سے کام لیتے نہ میرا احساس اتنا نازک ہوتا۔ میں آپ کے متعلق اکثر غور کیا کرتا ہوں کہ آپ اتنا اچھا قوام بنا لینے کے بعد آخر ملازمت کیوں کرتے پھرتے ہیں محمد عمر محمد صدیق کیوں نہیں بن جاتے جہاں تک تجارتی سوجھ بوجھ کا تعلق ہے اُس کی بھی خدا کے فضل سے کوئی کمی نہیں۔ محنت بھی آپ کر لیتے ہیں۔ رہ گیا اشتہار وہ خود آپ کا قوام ہے جس نے ایک مرتبہ بھی یہ قوام کھایا ہے ہزار مرتبہ دوسروں سے اس کی تعریف کی ہے۔ مثلاً خود میرا یہ عالم ہے کہ جب کبھی کسی نئے قوام کا کہیں ذکر چھڑ جاتا ہے یا کسی نئے قوام کو چکھنے کی نوبت آئی ہے میں غیر ارادی طور پر اُس کا آپ کے قوام سے موازنہ کرتا ہوں ؎

بیوں پہ ساغر و صہبا کی بات جب آئی

نگاہِ مست نے پہروں شراب چھلکائی

وجہ یہ ہے کہ میں نے اس قوام سے بہتر اب تک کوئی قوام نہیں کھایا ہے۔ ممکن ہے اس سے بہتر قوام بھی ہوتے ہوں مگر میرے مزاج نے اسی کو قبول کیا ہے۔ میں دراصل اس کے توازن اور اعتدال کا قائل ہوں اور میرا خیال ہے کہ اس قوام کو بنانے میں بھی آپ اپنے شاعرانہ توازن سے کام لیتے ہیں کہ مشک اور عنبران میں نشتر گری کی کیفیت پیدا نہ ہو، پپیرمنٹ بحر سے خارج نہ ہو جائے

پانڈی کی "ی" دبنے نہ پائے۔ الائچی کا الیف گرنہ جائے۔ اور اس کو کھانے والا امتلائے خفی یا امتلائے جلی میں بتلا نہ ہونے پائے۔ مختصر یہ کہ آپ کو قوام بنانے کا صرف نسخہ نہیں بلکہ ایک سلیقہ بھی حاصل ہے جس سے آپ کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے۔ قدرتی طور پر آپ کی صرف دو حیثیتیں ہیں شعر ساز اور قوام ساز۔ مگر تیسری حیثیت یعنی ملازمت وغیرہ آپ کی زبردستی ہے۔ یہی قوام بنایئے اور غزلیں کہیئے۔ سجادہ نشین آپ خاندانی طور پر ہیں ہی کیوں نہ کراچی یالاہور میں محمد عمر محمد صدیق کے سجادہ نشین بن کر بیٹھ رہیئے ؎

نہ رہی دشت میں خالی کوئی جا میرے بعد

قیس سجادہ نشین آکے ہوا میرے بعد

مگر ایک خدشہ ضرور ہے کہ قوام ہو یا کسی اور قسم کا خوردنی تنباکو۔ آخر ہے تو یہ پان ہی کا زیور۔ اور جب یہاں پان ہی ایک مرے سے عنقا ہے تو اس زیور کی کہاں کھپت ہو گی۔ اس میں شک نہیں کہ لوگ وہ نام نہاد پان کھانے لگے ہیں جو نہ در اصل پان ہے نہ اشرف المخلوقات کے کھانے کی کوئی چیز۔ اس کے ساتھ لاکھ قوام کھائے۔ الائچیاں چبائے۔ نقرئی اور طلائی گولیاں اس میں ملائیے مگر معلوم یہی ہوتا ہے کہ ٹاٹ کے ایک ٹکڑے پر کتھا چونا لگا کر اور یہ تمام اجزاء ملا کر کھا لئے ہیں آپ کو لکھنؤ کے وہ کہار تو یاد ہوں گے جو منہ سے سنتی بنا کرتے تھے۔ میں نے جب کبھی یہ پان کھا لیا ہے اپنے اوپر اسی قسم کا

کمار ہونے کا شبہ ہوتا ہے۔ صاحب یہ پان ہرگز نہیں ہے جوٹ اور پٹ سن کے خاندان کی کوئی چیز ہے۔ خدا اس سے محفوظ ہی رکھے تو اچھا ہے۔ اس پان کے رواج پانے کی طرف سے بھی مایوس ہوں۔ البتہ آپ کے قوام سے اپنے گلکے کو باغ و بہار بناتا رہتا ہوں۔ مگر یہ گٹکا یہاں کتنے لوگ کھاتے ہیں۔ ان حالات میں آپ کو یہ مشورہ بھی نہیں دے سکتا کہ آپ قوام ہی کو ذریعۂ معاش بنا کر بیٹھ رہیں۔ جب پان کا یہاں کوئی مستقبل نہیں ہے تو قوام کا کیا ہو سکتا ہے۔ بہرحال چند اہلِ ذوق کے لیے سہی آپ قوام بناتے ضرور رہیں۔ یہ اہل ذوق بھی چند دن کے بعد آپ کو نہ ملیں گے ؂

کہاں سے لائے گا ساقی کوئی یہ ذوقِ سلیم
ہمارے بعد درِ میکدہ نہ باز رہے

شوکت تھانوی

پروفیسر مسعود حسن ادیب کے نام

گڑھی شاہو - لاہور

سیدی!

آپ کے متعلق دنیائے ادب میں ایک عام چرچا یہ ہے کہ ادبِ اُردو کا جتنا بڑا دفینہ آپ کے پاس موجود اور محفوظ ہے اگر وہ سب کا سب دولتِ بیدار بن جائے تو نہ جانے کتنے ایسے چشمہ ہائے فیض پھوٹ نکلیں جو اُردو کو تہی دامانی کے طعنوں سے بچا لیں اور تشنہ کامانِ ادب کو اس حد تک سیراب کر دیں کہ وہ ایک تازہ عزم کے ساتھ زبان اور ادب کے لئے نئی راہیں نکالنے کے قائل ہو جائیں۔ آپ کے متعلق اس شہرت میں کچھ تو واقعہ ہے اور کچھ تہمت مگر آپ کی بے فیضی نے ہر تہمت کو بھی واقعہ

بنا رکھا ہے اس لئے کہ جو سرمایہ آپ کے پاس موجود ہے چونکہ وہی کسی کو نہیں ملتا لہذا جو کچھ اور بھی نہیں ملتا اس کے متعلق بھی یہی کہدیا جاتا ہے کہ یہ بھی پروفیسر مسعود حسن کے کتب خانے میں نہیں بلکہ "نہاں خانے" میں موجود ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آپ کی زندگی بھر کا سرمایہ یہی خرمن ہے اور آپ بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ ؎

ہم نے محفوظ کیا حسنِ بہار
عطرِ گُل صرفِ خزاں تھا پہلے

مگر اب اس مدفون خزانے کو دولتِ بیدار بنا کر یہ بھی تو کہیئے کہ ؎

ہم نے روشن کیا معمورۂ غم — ورنہ ہر سمت دھواں تھا پہلے
ہم نے آباد کیا ملکِ سخن — کیسا سنسان سماں تھا پہلے

مگر سُنا ہے کہ آپ اپنی اس دولت سے اُس ادب کو بھی مالا مال کرنا نہیں چاہتے جس کی در اصل یہ امانت ہے ادب اردو کے مختلف اصناف سے متعلق ایسے ایسے نادر اور نایاب نسخے آپ کے پاس موجود ہیں کہ اگر آپ بے محل بخل سے کام نہ لیں تو تحقیق و تفتیش کرنے والوں کو بہت سی گم شدہ کڑیاں مل سکتی ہیں اور آپ کا یہ فیض آپ کو زندہ جاوید بنا سکتا ہے۔ مگر معلوم نہیں کیوں آپ اسی میں اپنی انفرادیت کا تحفظ سمجھتے ہیں کہ تاریخ میں آپ کا ذکر اس قسم کے الفاظ میں آئے کہ ادب اردو کے سب سے گراں مایہ دفینے کے

تکیہ دار پروفیسر مسعود حسن گذرے ہیں جنھوں نے اُس وقت بھی اس دفینے پر آنچ نہ آنے دی جب خود ادب اُردو پر آنچ آرہی تھی اور اپنی خاص نگرانی میں بحفاظتِ تمام اس دفینے کو خاک میں ملا دیا اس دفینے کی حیثیت اس چراغ کی تھی جو ؏

نہ روشن کر سکا گھر کو نہ محفل ہی کے کام آیا

اور فرض کر لیجیے کہ ادب آردو کی محرومیوں کے معاوضے میں آپ کی یہ انفرادیت قائم بھی رہی تو کس کام کی ہے

نہ جانے کتنی شمعیں گل ہوئیں کتنے بجھے تارے
تب اک خورشید اتراتا ہوا بالائے بام آیا

سوال یہ ہے کہ اگر آپ کا ادبی ذخیرہ دُنیا کے کام نہیں آسکتا تو اس کی کیا قیمت ہے

اُن سے البتہ تذکرۂ دولتِ کونین ہے کیوں
جن غریبوں کو ترا گوشۂ داماں نہ ملا

کل ہی کی بات ہے اُردو ادب میں فنِ تمثیل کا مسئلہ زیرِ بحث تھا۔ اودھ کے واجد علی شاہی دور میں اندر سبھا کا اسٹیج ہونا طے ہے مگر وہ کس طرح اسٹیج ہوا۔ میک اَپ کے کیا انتظامات تھے۔ روشنی کا کیا اہتمام تھا۔ پردے کے باہر کیا تھا۔ پردے کے پیچھے کیا تھا۔ ہدایت کاری کی نوعیت

کیا تھی۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ ان تمام تفصیلات کا آپ سے علم ہو سکتا ہے اس لئے کہ آپ کے پاس اندر سبھا کی وہ پروڈیوسر کاپی تک موجود ہے جس پر خود واجد علی شاہ کے قلم سے ہدایات رقم ہیں۔ اب اللہ جانے یہ واقعہ ہے یا نہیں اگر یہ واقعہ ہے تو کس قدر افسوس کی بات ہے کہ ادب کے مورخ کو فن تمثیل کا باب لکھتے ہوئے یہ گمشدہ کڑی کہیں سے نہ مل سکے گی اور اگر یہ واقعہ نہیں تو بھی اس کی ذمہ داری آپ ہی پر ہے اس لئے کہ آپ کے پاس کیا کچھ چھپا ہوا ہے اس کا کسی کو علم نہیں اور اب صورت یہ ہو گئی ہے کہ جو کچھ کسی کو دستیاب نہیں ہوتا اس کے متعلق یہی کہدیا جاتا ہے کہ ہو نہ ہو مسعود صاحب کے پاس یہ چیز ہوگی۔

ان حالات میں ضرورت اس کی ہے کہ آپ ان نوادر کو اب سامنے لائیں اور چشمۂ فیض بن کر تشنہ کامانِ ادب کو سیراب کریں تاکہ ادب اُردو کے محسنوں کے سرِفہرست آپ کا نام بھی نظر آئے۔ آپ نے اس خزمن کو اُردو سے عشق ہی کے ماتحت تو جمع کیا ہے اور اس کو جمع کرنے میں کیا کیا پاپڑ بیلے ہیں اس کا اندازہ بھی ہر ایک کر سکتا ہے مگر اب اس عشق کا یہ حق بھی ادا کیجئے کہ یہ قیمتی سرمایہ یوں مفلوج نہ پڑا رہے بلکہ آپ کے نہاں خانے سے نکل کر ادب اُردو کو مالا مال کر دے۔ اس سلسلے میں آخر یہ طریقہ کار کب تک کہ ـــــ

؎ دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

اُردو آپ سے اب بھی ایثار چاہتی ہے کہ اس کو بے مائگی اور تہی دامانی کے طعنوں سے بچا لیں اور اس تحمل سے کام نہ لیں جس سے اب تک اپنے کتب خانے کے سلسلہ میں آپ نے کام لیا ہے۔

شوکت تھانوی

حاجی محمد مصطفےٰ خاں کے نام

گڑھی شاہو۔ لاہور

صدیقِ مکرم

؎ وائے قسمت کہ انھیں ڈھونڈھ رہا ہوں دن رات
اور وہ پاس ہیں اتنا بھی مجھے ہوش نہیں

مگر آپ کا یہ قرب ہزار فاصلوں کا ایک فاصلہ ہے۔ آپ ذاتی طور پر بلاشک آسی پاکستان میں موجود ہیں جس میں میں خود بھی ہوں مگر صفاتی طور پر آپ اب بھی آسی ہندوستان میں ہیں جہاں آپ کا اصغر علی محمد علی والا کارخانہ عطر ہے۔ آپ کے متعلق جب یہ معلوم ہوا کہ آپ پاکستانی بن گئے ہیں تو دل نے بے ساختہ الحمد للہ کا نعرہ بلند کیا تھا کہ اب پاکستان کی بساط پر بھی آپ عطر فشانی کریں گے

عطر سازی کا یہ مشہور کارخانہ پاکستان میں بھی کھل جائے گا۔ خیر عطر تو پھولوں میں تُلنے والوں کو مبارک ہو مگر مجھ کو یہ اُمید تھی کہ اب آپ آگئے ہیں تو آپ کے کارخانے کا قوام اور تمباکو تو مل ہی جایا کرے گا۔ مگر جب یہ معلوم ہوا کہ آپ اس ارادے سے تشریف نہیں لائے ہیں بلکہ صرف گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرنے کا ارادہ ہے۔ کارخانہ بدستور ہندوستان ہی میں رہے گا جس سے آپ کا کوئی تعلق نہ ہوگا تو یہ سمجھ لیجئے کہ ع

بس خون ٹپک پڑا نگہِ انتظار سے

بلکہ اس موقع پر آپ ہی کا شعر آپ کو سنانے کو جی چاہتا ہے کہ ؎

نہ کسی کام کا یہ ہے نہ کسی مصرف کا
دل میں گر عشق نہیں درد نہیں جوش نہیں

اصغر علی محمد علی کے کارخانہ کا مالک پاکستانی بن جائے اور اس کا کارخانہ پاکستانی نہ بنے اس سے بڑی ٹریجڈی اور کیا ہو سکتی ہے۔ میں عطر سے بحث نہیں کرتا۔ نہ عطر میرا موضوع نہ عطر کا میں قدر دان مگر آپ نے پاکستان میں تمباکو سازی کا اہتمام نہ کر کے بڑا ظلم کیا ہے۔ آپ کو کیا معلوم کہ صحیح قسم کا تمباکو کھانے کے لئے اہلِ ذوق کیسا کیسا ترس رہے ہیں۔ حد یہ ہے کہ اگر کبھی دھرم پال پریم چند تک کے کارخانہ کا تمباکو میسر آ جاتا ہے تو اسے آنکھوں سے لگاتے ہیں، تبرک سمجھ کر کھاتے ہیں ــــ

کرنا پڑا ہے اک بتِ کافر پہ اعتبار
بتلاؤ ایک مردِ مسلماں کیا کرے

آپ یہاں تشریف لاکر کارخانہ عطر اصغر علی محمد علی کے مالک نہیں رہے بلکہ کراچی میں اپنی کوٹھیوں کے مالک بن کر بیٹھ رہے ہیں۔ لینڈ لارڈ ہو کر رہ گئے بے محل نہ ہوگا اگر اس لینڈ لارڈ کے سلسلے کا ایک لطیفہ پیش کر دیا جائے دلی کی ایک دوکان پر سائن بورڈ نظر آیا "لارڈ جسونت سنگھ اینڈ کمپنی" دوکان کے مالک سردار جی سے پوچھا کہ اس "لارڈ" سے کیا مراد ہے وہ نہایت سادگی سے بولے کہ دراصل میں تقسیمِ ملک سے پہلے پنجاب میں لینڈ لارڈ تھا اب لینڈ تو اُسی طرف رہ گیا۔ صرف لارڈ رہ گیا ہے وہ سائن بورڈ پر لکھ دیا ہے۔ یہ تو خیر لطیفہ تھا مگر یہ المیہ بھی یاد رہے گا کہ آپ یہاں موجود ہیں اور کارخانہ وہاں موجود ہے جہاں آپ نہیں۔ ایک عجیب بات یہ ہے کہ ہندوستان سے پاکستان آنے والوں نے عام طور پر یہی کیا ہے بڑے بڑے صناع اور فنکار آنے کو تو اِدھر آ گئے مگر یہاں پہنچکر بجائے اس کے کہ اپنے فن کو از سرِ نو زندہ کرنے کچھ کے کچھ بن بیٹھے۔ مثلاً زردوزی کے فن کار یہاں اسٹیشنری کی دوکان الاٹ کرا بیٹھے۔ کارچوب بنانے والے برف کا کارخانہ لے بیٹھے۔ عطّار چھاپہ خانہ سنبھال بیٹھے۔ نتیجہ یہ کہ بیک وقت دو فنون کو نقصان پہنچا ایک وہ فن جس کے وہ ماہر تھے اور جس کو ترک کر دیا دوسرا وہ

فن جس سے وہ ناآشنائے محض ہیں مگر دخل در معقولات کر رہے ہیں ان کو یہ بھی اندازہ نہیں کہ ؎

ہر کسے را بہر کارے ساختند

بلکہ وہ تو یہ سمجھتے ہیں کہ ؎

طریقت پہ ہیں ہوں شریعت پہ واعظ
تفاوت ہی کیا اِس گلی اُس گلی میں

میں آپ کے متعلق یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ آپ نے اپنے فن کے بجائے کسی اور فن پر قبضہ کر لیا ہے مگر یہ ضرور کہونگا کہ اپنے اُس فن سے جسے آپ نے عروج پہ پہنچایا تھا پاکستان کو فائدہ اُٹھانے کا کوئی موقع نہ دیا۔ پاکستان میں لینڈ لارڈس کی کمی نہیں البتہ کارخانہ عطر اصغر علی محمد علی کے مالک اصطفا خاں کی کمی ضرور ہے حد یہ ہے کہ اصطفا خاں موجود ہیں پھر بھی یہ کمی ہے۔ آپ کہیں گے کہ پاکستان میں وہ قنوج کے پھول کہاں سے لاؤں۔ وہ نیپال کا مشک کہاں سے پاؤں وہ زعفران کہاں سے حاصل کروں مگر آپ اس طرف متوجہ ہوتے تو سب نہ سہی کچھ نہ کچھ تو مل ہی جاتا۔ عطر سازی کا سامان نہ سہی تمباکو سازی کا اہتمام سہی بہرحال کچھ تو کیا ہوتا مگر آپ نے تو دراصل ایک ریٹائرڈ قسم کی زندگی بسر کرنا شروع کر دی۔ آپ کی زندگی کے تین محبوب مشاغل تھے۔ اسکیٹنگ عطر سازی حصول سعادت حج بیت اللہ۔ اسکیٹنگ عمر کے نذر ہو گئی۔ عطر سازی تقسیم

ملک سکے ساتھ آپ کے حصّہ میں نہ رہی رہ گئی سعادتِ حج وہ آپ کو حاصل ہونی ہی رہتی ہے مگر ہم تشنہ کاموں کی سیرابی بھی آپ کا فرض ہونا چاہیئے ہماری دلدہی بھی کچھ کم کارِ ثواب نہ تھی ؏

دل بدست آور کہ حج اکبر است

نتیجہ یہ کہ آپ یہاں موجود ہیں اور ہم تمباکو کے نام سے نہ جانے کیا کھائے ہیں۔

شوکت تھانوی

ایلن سلونوی کے نام

گڑھی شاہو۔ لاہور

رفیقِ مکرم!

اصطفا خاں صاحب سے مخاطب تھا اور کن انکھیوں سے آپ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ مجھ کو براہِ راست یاد ہی نہیں آتے مگر اصطفا خاں صاحب کو مکتوب تحریر کرتے ہوئے ذہن اس دور کی طرف منتقل ہو گیا جب وہ ایک ادبی رسالہ ترچھی نظر کے نام سے نکالا کرتے تھے اور مولوی برکات احمد صاحب غالباً ان بزرگ کا نام نامی تھا، جو اس بانکے ترچھے رسالے کی ادارت فرماتے تھے۔ مجھے ہمیشہ اس رسالے کے نام پر ہنسی آیا کرتی تھی کہ نظر تو نظر مگر یہ ترچھی نظر کیا بلا ہے اور اگر یہ ترچھی نظر

کسی ادبی رسالے کا نام ہو سکتا ہے تو چھپن چھری بھی کیا برا ہے۔ مگر بعد میں پتہ چلا کہ اصطفا خاں صاحب کو تاریخ نکالنے کا شوق ٹھہرا لہذا رسالہ جو نکالا تو اس کا نام بھی تاریخی رکھا اور پوری تاریخ نکلتی تھی "ترچھی نظر بلدۂ لکھنؤ" سے۔ اصطفا خاں صاحب تو عالم یہ تھا کہ ان کے سامنے جاتے ہوئے ڈر لگتا تھا کہ کہیں یہ نہ کہہ دیں کہ "نکالوں تیری تاریخ" حد یہ ہے کہ خود اپنی وفات حسرت آیات کی کئی تاریخیں نکال چکے تھے مثلاً ایک تاریخ یاد رہ گئی ہے ؎

آج اصطفا جہاں سے سدھارے سوئے جناں
شکر خدا یہ قطرہ سمندر سے جا ملا

دوسرے مصرعے سے ۱۹۵۳ء نکلے ہیں پھر دوسرا مصرعہ بدل کر یہ تاریخ بھی نکالی تھی ؎

آج اصطفا جہاں سے سدھارے سوئے جناں
قطرہ خدا کا شکر سمندر سے جا ملا

اب دوسرے مصرعہ سے ۱۹۵۹ نکلتے ہیں۔ خدا اس دوسری تاریخ کو بھی اسی طرح غلط ثابت کرے جس طرح ۱۹۵۳ والی تاریخ غلط ثابت ہوئی ہے۔ ذکر تھا ترچھی نظر کا تاریخ نکالنے کے شوق میں رسالے کا یہ نام رکھا گیا تھا مطلب یہ تھا کہ تاریخ نکل آئے خواہ ایک ادبی رسالہ ترچھی نظر ہی کیوں نہ

کہلائے۔ مگر ایک مرتبہ جو رسالہ آیا تو اس کا بانکا ترچھا پن نکل چکا تھا اور اب اس کا نام صرف "نظر" تھا۔ اور ادارت میں آپ کا نامِ نامی اسمِ گرامی اس انقلاب پر طبیعت خوش ہو گئی، اور دل نے گواہی دی کہ یہ امین سلوتری کوئی نہایت معقول قسم کے آدمی نظر آتے ہیں جن کے ذوقِ سلیم نے یہ گوارا نہ کیا کہ ان کے ادارت میں نکلنے والے رسالے کا نام ترچھی نظر ہو۔ اس کے کچھ ہی دن بعد آپ سے نیاز حاصل ہو گیا۔ غازی انور بے کی قسم کی مایل پرواز مونچھیں پھڑکتے ہوئے نتھنے اور بڑی بڑی پچھے دار باتیں۔ آنکھوں میں ذکاوت اور ذہانت کی چمک اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ جیب میں چھالیہ کا بٹوہ اور چنوٹی۔ میں نے سب سے پہلے پان کا یہ نعم البدل آپ ہی کے بٹوے سے چکھا تھا حالانکہ آج تک یہ سمجھ میں نہ آسکا کہ اس کو گوٹا کہوں گٹکا کہوں یا حلوہ کہوں۔ اس لئے کہ آپ کے بٹوے میں صرف چھالیہ الائچی لونگ اور تمباکو ہی نہ ہوتی تھی بلکہ ان تمام چیزوں کے علاوہ پستے اور بادام بھی ہوتے تھے۔ نارنگی کے چھلکے بھی ہوتے تھے اور آپ یہ سب کچھ خود بھی نوش فرماتے تھے اور دوسروں کی بھی تواضع کرتے تھے رفتہ رفتہ جب آپ کو اپنی تعمیر کے سلسلے میں اپنے اخراجات کا توازن قائم کرنے کی فکر ہوئی تو اس بٹوے پر بھی تخفیف کا نزلہ گرا۔ الائچی کی جگہ بڑی الائچی نے لے لی۔ پستے اور بادام غائب ہو گئے نارنگی کے خشک چھلکوں کی ممتد ... گئی اور اب بٹوہ بھی آنکھ بچا کر کھولا جاتا تھا

اور اس احتیاط میں کبھی کبھی خود بھی اس مطلب کے لیئے ترسنا پڑا اس لیے کہ اگر اپنے لئے بٹوہ نکالتے ہیں تو چیل جھپٹے والے بھی موجود ہیں۔ نتیجہ یہ ہونا تھا کہ کہنا پڑتا تھا کہ ؎

یہ بے فیض خزانہ تیرا تیرے کام نہ آئے گا

تو نے دنیا کو ترسایا یہ تجھ کو ترسائے گا

تھیلی کھول کے ہو جاتا ہے حال برا ہر بار ترا

کر ڈالے گی یہ دولت آخر اک دن بیڑا پار ترا

مگر ماننا پڑتا ہے کہ آخر یہی احتیاط آپ کے کام آئی۔ اسی کفایت شعاری نے یہ دن بھی دکھایا کہ اب خدا کے فضل سے صاحبِ جائداد ہیں اور خدا کا شکر ہے کہ زمانے کا ایسا ساتھ دیا ہے کہ زمانہ بھی ساتھ دینے پہ مجبور ہوا۔ یہ وصف آپ میں ہمیشہ رہا کہ ہر موقع اور ہر محل کے سانچے میں اپنے کو ڈھالتے رہے ؏

باما شراب خوردہ و بہ زاہد نماز کردہ

آپ کی خبر رساں ایجنسی جس میں پہلے اُردو ٹائپ رائٹر کی ٹپاٹپ سُنی جاتی تھی حالات بدلے تو اب وہاں ہندی ٹائپ رائٹر بھی موجود ہے ؏

میرے دونوں ہاتھ نکلے کام کے

اور اس کے باوجود حوصلوں کا یہ حال ہے کہ ؎

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

مگر میں خوش ہوں کہ آپ ایک عملی انسان ہیں۔ دن رات اپنی دھن میں سرگرداں،
مولوی اسمٰعیل میرٹھی نے آپ کے متعلق سچ کہا ہے کہ ؎

نہر پہ چل رہی ہے پن چکی
دھن کی پوری ہے کام کی پکی

اس سخت کوشی کو دیکھ کر اپنی بے عملی پہ ہمیشہ شرم آتی ہے معلوم نہیں
آپ بھی اپنی اس سخت کوشی پہ کبھی شرماتے ہیں یا نہیں۔ خیر چھوڑیئے اس
ذکر کو کھولیئے اپنا بٹوہ ادھر میں اپنی خوراک تیار کرتا ہوں۔

شوکت تھانوی

کنور مہندر سنگھ بیدی کے نام

گڑھی شاہو - لاہور

حبیبی!

بعض باتیں ایک دم سے ایسی چونکا دینے والی ہو جاتی ہیں کہ سوائے آئینہ حیرت بن کر رہ جانے کے اور کچھ ممکن نہیں ہوتا۔ اسی قسم کی ایک بات اس وقت ذہن میں اُبھری ہے اور نگاہوں سے گذرا ہوا ایک منظر پھر نگاہوں کے سامنے آیا ہے کہ گوڑگاؤں میں ایک بین المملکتی قسم کا مشاعرہ گرم ہے جس کے بانی گوڑگاؤں کے ڈپٹی کمشنر ہیں جو صرف ڈپٹی کمشنر ہی نہیں بلکہ سکھ بھی ہیں مگر کیسے سکھ؟ مشاعروں کے رسیا اور خود نہایت خوش گو اور پختہ مشق شاعر یہ سب کچھ درست ہے مگر ان کے

راسخ الاعتقاد سکھ ہونے سے بھی انکار نہیں کیں۔ داڑھی تمبا کو سب کچھ چھوڑ کے ہوئے سکھ۔ یہ سمجھ کر کہ یہ ایک عام مشاعرہ نہیں بلکہ ایک سکھ کا منعقد کیا ہوا مشاعرہ ہے شرکت کے لئے چلے تو پانوں کی ڈبیا لبالب بھری۔ بٹوہ بھی کھچا کھچ پُر کر لیا کہ اس مشاعرے میں بھلا پان کہاں۔ ممکن ہے سکھ پان کھاتے ہوں مگر میں نے اب تک پان اور سکھ میں بعد المشرقین سمجھ رکھا تھا۔ آپ کے متعلق بھی یقین تھا کہ پان سے بھلا آپ کا کیا تعلق ؎

پوچھئے میکشوں سے لطفِ شراب
یہ مزہ پاکباز کیا جانیں

مشاعرے میں پہنچتے ہی پانوں کی کشتی نظر آئی۔ دل نے کہا رواداری اس کو کہتے ہیں۔ وضعداری اسی کا نام ہے مشاعرہ بغیر پان کے بے رنگ سا ہو جاتا ہے۔ پان اور حقّہ یہی تو دو آرائشیں تھیں مشاعروں کی۔ حقّے کی طوالت اور حقّے کے اہتمام کی دردسری کو دیکھتے ہوئے اس کے متعلق تو کہہ دیا گیا کہ ؎

حقّہ کہ با عفونتِ دوزخ برابر است

اور اس کی جگہ سگریٹ نے لے لی مگر مشاعرے ابھی اتنے فلیش ایبل نہیں ہوئے ہیں کہ پان کی جگہ چوئنگ گم کو دیدی جائے۔ بہر حال اس مشاعرے میں پان کا دَور چل رہا تھا۔ یہ بات خوشی کی ضرور تھی مگر چونکا دینے والی بات تو اب آتی ہے کہ کسی کی آواز سماعت میں گونجی کہ "کنور صاحب کے پان کہاں ہیں

ظاہر ہے کہ کنور صاحب تو آپ ہی کو کھا گیا تھا مگر آپ پر پان کی تہمت؟
سمجھ میں نہ آسکی یہ بات۔ مگر یہ بات جو کہ سمجھ میں نہ آئی تھی وہ دیکھ کر سمجھ میں
آگئی کہ فوراً سفید رنگ کے بنارسی پانوں کی گلوریاں آپ کے سامنے تھیں ایسی
خوش رنگ حسین اور سڈول گلوریاں جیسے چنبیلی کی کلیاں ہوں۔ اور پھر آپ کا
نہایت شوق سے ان کو کھانا ؎

گلشن میں ترے لبوں نے گویا   رس چوس لیا کلی کلی کا

میں نے حیرت سے یہ منظر دیکھا اور یہ کہے بغیر نہ رہ سکا کہ ؎

آج تو جام بکف آپ کو بھی پاتا ہوں
حضرتِ شیخ میں آداب بجالاتا ہوں

اور جب یہ حسین جمیل گلوریاں میری طرف بڑھائی گئیں تو پہلی گلوری کھانے کے
بعد تو یہ اندازہ ہوا کہ اونٹ کے مُنہ میں زیرے کی کیا بساط۔ معلوم ہوا کہ
پان نہیں بلکہ پان کا تصوّر رکھا یا ہے۔ جس میں روح ہی روح ہے ایک معطّر
سی خنک روح مگر بے حد لطیف اور نہایت نُسبک۔ دوسری اور تیسری
گلوری کھانے کے بعد بھی اندازہ یہی ہوا کہ پان کھا نہیں رہے ہیں بلکہ پان
کھانے کا خواب شیریں دیکھ رہے ہیں آخر ان حسین و جمیل گلوریوں کے متعلق
یہ نکتہ سمجھ میں آگیا کہ ؎

حُسن وہی ہے حُسن جو ظالم   ہاتھ لگائے ہاتھ نہ آئے

اب میں نے یکشت کئی گلوریاں کھا کر اپنا خشکی دانہ بھر کھایا تو معلوم ہُوا کہ یہ حسن اسی شباب کا منتظر تھا۔ اور اس کے بعد مجھ کو اعتراف کرنا پڑا کہ اس مزے کا پان میں نے کبھی نہیں کھایا۔ جس سبک خرامی سے کسی مغنّی کا نغمہ سماعت میں داخل ہوتا ہے اُسی انداز سے یہ پان حلاوت میں تیرتا ہُوا محسوس ہُوا۔ معلوم ہُوا کہ میں پان کھا نہیں رہا ہوں بلکہ پان کے گن گا رہا ہوں ؎

جو کوئی سن سکے تو نکہتِ گل
شکستِ رنگ کی جھنکار بھی ہے

میرے تو تصور میں بھی نہ آسکتا تھا کہ آپ اس سلیقے سے پان کھاتے ہوں گے۔ آپ پان کھانے کے عادی نہیں ضرور تا نہیں بلکہ تفریحاً پان کھاتے ہیں مگر کس خوش مذاقی اور کس پاکیزگیٔ ذوق کے ساتھ۔ اب یقین آیا کہ سکھ نہ صرف یہ کہ پان کھا سکتا ہے بلکہ اس نفاست کے ساتھ کھا سکتا ہے ؎

جہاں ہے شوق وہاں کیف وکم کی بات نہیں
دیارِ عشق میں دیر و حرم کی بات نہیں

اور یہی ستھرا ذوق کبھی آپ کی شاعری بن جاتا ہے۔ کبھی آپ کی سخن فہمی کبھی آپ کی زبان بن جاتا ہے اور کبھی آپ کا بیان۔ مگر آپ نے کبھی اس پہ بھی غور فرمایا کہ آپ کی نفاستِ طبع خود آپ کو کس قدر محبوب بنائے ہوئے

ہے آپ سے محبت کرنے کو جی چاہتا ہے۔ وہ محبت جو ٹھنڈی ہواؤں سے کی جاتی ہے۔ سحر کی رنگینیوں سے کی جاتی ہے۔ شام کی ملاحتوں سے کی جاتی ہے۔ اب اللہ جانے یہ محبت ہے یا خودغرضی۔

شوکت تھانوی

ظریف جبلپوری کے نام

گڑھی شاہو۔ لاہور

حبیبِ مکرّم!

آپ شعر تو خیر مزاحاً کہتے ہیں مگر پان بڑی سنجیدگی سے کھاتے ہیں اور یہ تخمینہ آج تک نہ لگ سکا کہ عمرِ عزیز کا کتنا حصہ آپ نے شعر کہنے میں بسر کیا ہے اور کتنا گلوریاں بنانے میں بہرحال جہاں تک سرخروئی کا تعلق ہے وہ آپ کو اپنے ان دونوں مشاغل میں حاصل ہوئی۔ ویسے تو خیر آپ ریڈیو کی قسم کے انسان ہیں اپنی کہتے ہیں دوسرے کی نہیں سُنتے یا اگر سُنتے بھی ہیں تو اس طرح کہ ؎

بہرا ہوں میں تو چاہیئے دونا ہو التفات　　سُنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

اور یہاں یہ عالم ہے کہ ؎

میں سننے کے لئے پیدا ہوا ہوں
وہ جو چاہیں کہیں ان کی زباں ہے

مگر ایک بات آج آپ کو زبردستی سنانا ہے اور آپ سے اس کا جواب لینا ہے کہ آخر آپ اپنے متعلق یہ کیوں سمجھتے ہیں کہ ؏

حالانکہ شعر گو نہیں صرف ظریف ہے ظریف

اور یہ آپ نے کیوں طے کر لیا ہے کہ چونکہ آپ کا تخلص ظریف ہے لہذا آپ صرف ظرافت ہی فرماتے ہیں۔ کیا آپ کا خیال یہ ہے کہ مشاعروں میں آپ جو کچھ فرماتے ہیں اُسے سُن کر چونکہ سُننے والے ہنستے ہیں لہذا یہ طے ہے کہ وہ ظرافت ضرور ہوتی ہے۔ بھائی میرے اگر سچ پوچھئے تو یہ آپ سے زیادہ آپ کا کلام سُننے والوں کی ظرافت ہے کہ وہ رو دینے کی جگہ ہنس دیا کرتے ہیں مثلاً اب آپ ہی بتائیے کہ آپکے ان اشعار میں ہنسی کی کیا بات ہے ؎

غریبی مسئلہ ایسا ہے اس دنیائے فانی میں
کبھی طے ہو نہیں سکتا جو اپنی زندگانی میں

امیروں کی ہوس ناکی میں پھنس جانا غریبی ہے
بجائے نان و قلیہ گھڑکیاں کھانا غریبی ہے

غریبی دام عصیاں ہے غریبی آفت جاں ہے
اور اپنے ملک کا ایک ایک بچہ اس پہ قرباں ہے

اب اگر ان اشعار پر آپ کے سامعین ہنستے ہیں تو یہ سخن فہمی سے زیادہ بے غیرتی ہے۔ یا مثلاً آپ کا وہ مرثیہ جس کا نام "لالوکھیت" ہے جب آپ سناتے ہیں سننے والے ہنسی کے مارے لوٹ لوٹ جاتے ہیں اور میں حیران رہ جاتا ہوں کہ خانہ بدوشی کی اس خونچکاں داستان پر یہ قہقہہ بلند کرنے والے آخر کس مٹّی کے بنے ہوئے ہیں۔ اللہ جانے یہ لوگ اُردو زبان نہیں سمجھتے یا ان میں اب تک یہ شعور پیدا نہیں ہوا ہے کہ ہنسنے اور رونے کے کیا محل ہوتے ہیں ضرورت اس کی ہے کہ آپ ہر نظم کے ساتھ ایک پرچہ ترکیب استعمال بھی پبلش کر دیا کریں کہ اس نظم پر خواہ مخواہ ہنس کر اپنے کو احمق اور شاعر کو مسخرا ثابت نہ کرو۔ یہ بڑی عبرت انگیز نظم ہے اور اس میں ہنسنے سے زیادہ رونے کے مقامات ہیں۔ اب آپ اس کو میری ناسمجھی سمجھیں یا دیوانگی کہ مجھ کو آپ کے ان اشعار میں بڑی ٹریجڈی نظر آتی ہے کہ ؎

لے گیا ہے سب کو آب و دانہ لالوکھیت میں
مجھ کو بھی لے چل دلِ دیوانہ لالوکھیت میں
تم کو اپنی کو ٹھیوں کے آٹھ کمروں کی قسم
اک چٹائی کا مکاں بنوانا لالوکھیت میں

ہمنشیں آبادکاری جس کو کہتے ہیں عوام
سولہ آنے ہیں نہیں ایک آنہ لالوکھیت میں

ہم کو ان سے کیا ملا ہے دو چٹائی چار بانس
بن گیا ہے جس سے دولت خانہ لالوکھیت میں

تم کو جو تکلیف ہے شاید انھیں احساس ہو
کچھ بڑے لوگوں کو دو عصرانہ لالوکھیت میں

دیدۂ عبرت سے دیکھیں تو ذرا اہلِ قلم
بن رہی ہے زندگی افسانہ لالوکھیت میں

ہم مہاجر شمعِ پاکستان کے پروانے ہیں
مل گئی خاک پر پروانہ لالوکھیت میں

اس مرقّعِ عبرت پر ٹھٹھے مارنے والے عموماً وہی لوگ ہوتے ہیں جن کو آپ عصرانہ دے کر لالوکھیت میں بلانا چاہتے ہیں۔ کیا آپ کے سامعین وہی لوگ نہیں ہوتے جو اپنی تفریحِ طبع کے لئے آپ کے مصائب کی داستان سننا چاہتے ہیں۔ میں مثالیں دے کر سمجھانا نہیں چاہتا صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ عموماً ہم اپنے مصائب اور اپنی مشکلات کی داستانیں لطیفہ کے طور پر ان کو سناتے ہیں جن کے لئے ہمارے مصائب اور ہماری مشکلات بڑے شگفتہ موضوع ہیں جنھیں سُن کر ان کا دل بہلتا ہے۔ ذرا ہنسی آتی ہے۔ جی خوش ہوتا ہے اور ہمارے

غم کی تفصیلات سے وہ اپنے غم غلط کرتے ہیں۔ طرفہ تماشہ یہ ہے کہ ہم خود ان کو ہنسا کر خوش ہوتے ہیں اور ناز کرتے ہیں کہ ہماری یہ نظم کامیاب رہی۔ ہنستے ہنستے لوگوں کا برا حال ہو گیا۔ حالانکہ اگر غور کیجئے تو آپ سوسائٹی کے ناسور بغرض اصلاح پلش کرتے ہیں۔ یہ وہ مقتضے ہیں جنھیں دیکھ کر شرم سے سر جھک جانا چاہئیں مگر مصیبت تو یہ ہے کہ اگر آپ کی ان نظموں پر آپ کے سامعین سنجیدگی سے غور کرنا شروع کر دیں اور ہنسنے میں بخل سے کام لیں تو آپ خود برا مان جائیں۔ ان کو کور ذوق۔ سخن ناشناس۔ اور بدمذاق کہیں۔ کاش ہم آپ سب مل کر کوئی فیصلہ کر لیں کہ ہمارے اس قسم کے کلام کی پذیرائی کی کیا صورت ہو اور ہم اپنے کو کس قسم کا شاعر سمجھیں۔ اور شاعر بھی سمجھیں یا فقط ظریف؟

شوکت تھانوی

پنڈت ہری چند اختر کے نام

گڑھی شاہو۔ لاہور

حبیبی!

اکثر سوچتا ہوں کہ آپ اس شدت سے سبزی خور کیوں ہیں۔ نام ہے ہری چند اور بنے ہوئے ہمیشہ "ہری چُگ" زندگی گذری ہے ہمیشہ اُن احباب کے ساتھ جو گوشت کے اس حد تک قائل تھے کہ یہ بھی ان کی عنایت تھی کہ آدم خوری ترک کئے ہوئے تھے۔ مگر آپ نے ہمیشہ پرہیز کیا کباب اور شراب دونوں سے اور پھر بھی جانِ محفل بنے رہے خیر یہ تو سب کچھ ٹھیک ہے کہ ہندو بھی بنے رہے اور آدمیت پر بھی آنچ نہ آنے دی ع

زنار کے رشتے سے ہاتھ سے جنت نہ گئی

مگر اس سبزی خوری کے باوجود یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ اس رنگِ سبز سے کیوں پرہیز کیا جس کو پان کہتے ہیں۔ جو فرقہ دارانہ تعصب آپ کے آس پاس کہیں بھی نظر نہیں آتا وہ پان سے کیوں روا رکھا گیا۔ کاش آپ کو اندازہ ہوتا کہ محض پان کھا کر آپ کی وہ شخصیت جس میں بلا کی جاذبیت ہے اور بھی کتنی محبوب ہو جاتی۔ بخدا یہ دیکھ کر دل دکھتا ہے کہ جب آپ کی طرف پان بڑھایا جائے تو آپ صرف چھالیہ کے چند دانے۔ یا ایک آدھ الائچی یا ایک آدھ لونگ لیکر سلام کر لیتے ہیں اور پان سے بھی اس طرح ڈرتے ہیں کہ کہیں یہ بھی انگور کی بیٹی کی طرح اتحو رکا باپ ثابت نہ ہو جائے۔ آپ کی طرح بے شمار لوگ ہیں جو پان نہیں کھاتے بلکہ دُنیا کی بیشتر آبادی پان نہیں کھاتی مگر اس محروم القسمت اکثریت پر مجھے کبھی افسوس نہیں ہوتا البتہ آپ مجھ کو اس قدر عزیز ہیں کہ نہ جانے کیوں میرا جی چاہتا ہے کہ یہ خوش مذاقی آپ میں ضرور پیدا ہو جائے اور میں آپ کے پان کھائے ہوئے لبوں سے گل افشانیٔ گفتار کا لطف حاصل کر سکوں۔ میں آپ کو صرف یہ یقین دلانا چاہتا ہوں کہ پان بجائے خود ایک سبزی ہے اور آپکے دائرہ اختیار سے باہر کی کوئی چیز نہیں۔ آپ اس کو پان سمجھ کر نہ سہی ترکاری ہی سمجھ کر کبھی کبھی کھا لیا کریں۔

خدا کرے آپ کا شمار اُن لوگوں میں نہ ہو جو سگریٹ کو پان کا نعم البدل

سمجھتے ہیں ؏

چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک

سگریٹ کو اگر حُقّے کا "نیم تیم" سمجھا جائے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں مگر
پان کو جو لوگ سگریٹ کی بستی میں لاتے ہیں اُن کی اس زیادتی پر افسوس ضرور
ہوتا ہے اور میں آپ سے عرض نہیں کر سکتا کہ ریلوے اسٹیشنوں پر خوانچہ فروشوں
کی یہ صدا مجھ کس قدر گراں گذرتی ہیں کہ "پان بیڑی سگریٹ" اور یہ دیکھ کر
ذوقِ سلیم کا کیسا خون ہوتا ہے کہ بازاروں میں بھی پان اور سگریٹ کی مشترکہ
دوکانیں نظر آتی ہیں۔ مگر ان کے گاہک بھی کچھ ایسے ہی ہوتے ہیں جو وہ نام نہاد
پان کلّے میں ٹھونس کر اوپر سے سگریٹ بھی سلگا لیتے ہیں خیر اس طرح سگریٹ
کی قدر تو کچھ بڑھ جاتی ہے مگر پان کی جو تحقیر ہوتی ہے وہ بیان نہیں کی جاسکتی۔
حالانکہ وہ پان بھی اگر سچ پوچھیے تو پان ہوتا ہی کب ہے۔ بیڑی کی صحبت ناجنس
میں وہ خود خشک نہ سہی تر قسم کی بیڑی بن کر رہ جاتا ہے۔ ورنہ پان تو کچھ
اور ہی چیز ہے۔ اس جنسِ گراں مایہ کا اس بازاریت سے کیا تعلق۔ پان جو
ناز و نعم چاہتا ہے وہ ان پنواڑیوں اور ان خوانچہ فروشوں کے بس میں کہاں
ہے۔ یہ بیچارے پان بنانے سے زیادہ پان بگاڑنے کی خدمات انجام دیتے
ہیں اور پان کے لئے رسوائی سرِ بازار کے امکانات پیدا کرتے ہیں۔ مگر اس طرح
کی پان فروشی کے باوجود اصل قسم کے پان پر کوئی آنچ نہیں آتی ؏

ہزار بار بھی یوسف بکے غلام نہیں

آپ بھی کہیں گے کہ میں آخر آپ کے سامنے یہ پاندان کھول کر کیوں بیٹھ گیا ہوں۔ آپ کا پان سے کیا تعلق۔ مگر یہی تو میں عرض کر رہا ہوں کہ یہ بے تعلقی کیوں ہے یہ بیگانگی کس لئے ہے۔ تقسیم ملک کے بعد آپ اِدھر سے اُدھر پہنچ گئے ہیں جہاں آپ کو صحیح قسم کے پان کھانے کے مواقع حاصل ہیں۔ آپ سگریٹ سے شوق فرماتے ہیں تو کونسا تیر مارتے ہیں سگریٹ تو ٹمبکٹو میں بھی پھونکا جاتا ہے زنجبار میں بھی پیا جاتا ہے مگر آپ تو دریا کے کنارے رہ کر بھی تشنہ ہیں اور ایک ہم ہیں کہ یہاں وہ پان میسر نہیں ہے مگر وضعداری قائم ہے اور اس رنگ کے ساتھ قائم ہے کہ جو نام نہاد پان یہاں ملتا ہے اُسے کبھی مُنہ نہیں لگایا اگر کبھی اصل نسل کا پان مل گیا تو یہ شوق پُورا کر لیا ورنہ خشک مسالہ ہی سہی۔ طبیعت نے یہ شرک کبھی گوارا نہیں کیا کہ جو پان بھی میسر آ جائے اس کو پان سمجھ کر اپنے کو فریب دے لیں اور بجائے پان کے پان کا دھوکہ کھایا جائے اور نہ اس زندگی میں یہ ہرجائیت پیدا ہونے دی کہ پان کی طلب کو سگریٹ سے پُورا کیا جائے۔ پان کا نعم البدل صرف پان ہے اور یہ بھی طے ہے کہ ہر قسم کے سبز پتّے کو پان نہیں کہا جا سکتا۔ جہاں آپ ہیں وہاں سے آنے والے اکثر پان لے آتے ہیں۔ وہاں کے بعض احباب بھی پان بھیجا کیا کرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ ان ہی داموں مجھ کو خریدا جا سکتا ہے چنانچہ اس طرح کبھی کبھی مجھ تک بھی دورِ جام آ جاتا ہے۔ خدا کے لئے اس کوشش طلب

نہ سمجھے گا اور نہ دراصل میں اس پردے میں آپ ہی کا شعر آپ کو سنانا چاہتا ہوں کہ ؎

ہمیں بھی آپڑا ہے دوستوں سے کام کچھ یعنی
ہمارے دوستوں کے بے وفا ہونے کا وقت آیا

اسی ڈر کے مارے میں یہ آزمائش کرنا ہی نہیں چاہتا اس لئے کہ شاید آپ کو یقین آسکے کہ مجھ کو جان سے بھی زیادہ آپ کی دوستی عزیز ہے جس کو میں کسی رنگ میں مشکوک دیکھنا نہیں چاہتا۔

شوکت تھانوی

نواب مرزا جعفر علی خان اثر لکھنوی کے نام

گڑھی شاہو۔ لاہور

اخی مکرم!

مولانا عبدالحلیم شرر کی ایک کتاب کا نام ہے "مشرقی تمدن کا آخری نمونہ" یہ کتاب میرے پاس ہے اور جب کبھی نگاہوں کے سامنے آتی ہے ذہن فوراً منتقل ہوتا ہے آپ کی طرف۔ اس لیے کہ میرے ذہن نے یہی نام آپ کا رکھ چھوڑا ہے۔ لکھنؤ میں مدتوں خود بھی رہا ہوں اور بزرگوں سے لکھنؤ اور اس کے تمدن کے متعلق جو کچھ سنا ہے وہ سب کچھ جیسے ایک پیکر میں سمٹا ہوا نظر آیا وہ آپ کی ذات ہے۔ ہر چند کہ میں نے آپ کو کبھی انگرکھے میں نہیں دیکھا۔ مٹھی میں بٹیر دبائے آپ نظر نہیں آئے مگر اس کے باوجود

مہذب اور شائستہ لکھنؤ کی نمائندگی کرتے رہے۔ خود لکھنؤ سے جو لکھنویت نہایت تیزی کے ساتھ رخصت ہو رہی تھی اس کو آپ اپنائے رہے اور آپ سے ملنے والوں کو یہ اطمینان ہوتا رہا کہ اب بھی لکھنؤ میں لکھنؤ باقی ہے۔ لب و لہجہ میں وہی شیرینی۔ الفاظ میں وہی مٹھاس۔ عادات میں وہی نفاست، طبیعت میں وہی لوچ، مزاج میں وہی لچک اور کہیں بھی کسی صناعی کو کسی اداکاری کو کسی ارادے کو دخل نہیں یہ سب کچھ ایک عجیب بے ساختگی کے ساتھ۔ کہنے والے اس لکھنویت کو تصنّع کہتے ہیں اور غالباً اس لئے کہتے ہیں کہ نقال جب اس شائستگی اور شستہ عادات کی نقل اتارتے ہیں تو اس نقل میں یقیناً تصنّع پایا جاتا ہے مگر جس اصل کی یہ نقل ہوتی ہے اس اصل کو تو تصنّع نہیں کہا جا سکتا ان کو اس تصنّع کی کیا ضرورت ہے جو اسی شائستگی کی گود میں پلے ہوں جن کی گھٹی میں یہ تہذیب اور تمدن ملا ہو۔ مجھے کسی اور سے کوئی مطلب نہیں خود میں نے یہ تصنّع بھی دیکھا ہے اور وہ بیساختگی بھی جو آپ میں مجھ کو نظر آئی۔ آپ کو میں نے کبھی بنتے نہیں دیکھا بلکہ آپ ہمیشہ بنے بنائے ایسے ہی نظر آئے اور اب ذہن اس طرف منتقل ہوا ہے کہ جس تصنّع کا میں ذکر کر رہا تھا وہ در اصل پیدا ہی اس طرح ہوتا ہے کہ خود میرا بے اختیار جی چاہا کرتا تھا کہ کاش میں بھی ویسا ہی شستہ اور شائستہ بن جاؤں جیسا آپ کو دیکھ رہا ہوں اب اگر یہ کوشش کامیاب بھی ہو جاتی تو وہی فرق باقی رہتا جو آمد اور آورد میں ہوتا ہے

یا بڑی احتیاط سے کام لیتا تو بھی وہ فرق تو بہر حال ہوتا جو اہلِ زبان اور زبان داں میں ہوتا ہے۔ ایک تھانوی لاکھ لکھنوی بننے کی کوشش کرتا کہیں نہ کہیں سے تھانہ بھون جھانک کر بجائے تسلیمات عرض کرنے کے السلام علیکم کہہ کر بھانڈا پھوڑ ہی دیتا اور کوئی نہ کوئی غیر ٹکسالی حرکت سرزد ہو ہی جاتی۔ چنانچہ میں نے تو اپنے لئے اتنا ہی کافی سمجھا کہ آپ کی محبوب شخصیت کی خاموش پرستاری کرتا رہوں۔ غیر ارادی طور پر اگر آپ سے کچھ حاصل کر لیا ہو تو اس کو چوری نہ سمجھئے میری خوردی کا حق سمجھئے۔ مثلاً آپ کے پان کھانے کا سلیقہ اور نفاست مجھ کو اپنانا پڑی۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے آپ ہی کے خاصدان اور آپ ہی کی چاندی کی ڈبیا کی گلوریوں سے اور آپ ہی کی قوام کی شیشی سے صحیح طریقہ پر پان کھانے کا سبق حاصل کیا۔ جب تک وہ گلوریوں کے سانچے میں ڈھل جانے والے پان میسر آئے ہیں یہاں بھی اسی چاؤ چونچلے سے پان کھاتا رہا مگر اب وہ پان یہاں کہاں۔ اگر کبھی کبھی آ جاتے ہیں تو بھی گلوریاں بنانے کے بجائے ایک ایک پان کے کئی کئی ٹکڑے کر کے نہایت کفایت شعاری کے ساتھ بلکہ ندیدے پن کے ساتھ چھوٹے چھوٹے تعویذ نما پان بنا لیتا ہوں تاکہ بجائے ایک دن میں ختم کر دینے کے کئی دن کھا سکوں ؎

بسائی جاتی ہے اس میں قمیص یوسف کی
ہوا جو مصر سے بیت الحزن میں آتی ہے

اللہ اللہ کیا کیا اہتمام ہوتے ہیں ان پانوں کے لئے۔ یہ پان مل جائیں تو بہتر سے بہتر قوام ڈھونڈھا جاتا ہے۔ اچھے سے اچھا تنبا کو مہیا کیا جاتا ہے اور پھر ان پانوں کو کھا کر محسوس ہوتا ہے کہ ع

نفس نفس میں نئی روح تن میں آتی ہے

شاید آپ نے اس کو محسوس نہ کیا ہو مگر مجھ کو اب تک اپنی اس زیادتی پہ ندامت محسوس ہوتی ہے کہ باوجود اُس احترام کے جو میرے دل میں آپ کے لئے ہے اور باوجود اُن حدودِ ادب کے جو ہونا چاہئیں ہمیشہ یہ ہوا ہے کہ جس کسی مشاعرے میں یا جس کسی اجتماع میں آپ مجھ کو نظر آ گئے ہیں صورتِ سوال بن کر آپ کی طرف بڑھا اور ڈبیا کو کچھ اس انداز سے دیکھتا رہا کہ آخر آپ نے مسکراتی ہوئی نگاہوں سے ڈبیا میری طرف بڑھا دی۔ زبان سے کچھ نہ کہا مگر نگاہوں سے وہ محبت برسا دی کہ میں پھولا نہ سمایا ؎

اگر ہونٹ سی بھی لئے کیا ہوا

نگاہوں سے اُلفت ٹپکتی رہی

کئی بار دل میں خیال آیا کہ بڑے بھائی کے سامنے پان ہی کھانا کیا کم گستاخی ہے کہ خود اُن ہی کی ڈبیا سے پان کھایا جائے۔ مگر ان پانوں کی لذت ہمیشہ اس گستاخی پہ مجبور کرتی رہی۔ اس ڈبیا کے پان کھانے والے ہی جانتے ہوں گے کہ یہ پان کیا ہوتے ہیں ؎

نہ رہے گی نہ چلن لذتِ غم اُس شکار کو
جو کھا کے تیرے ہاتھ کی تلوار جائے گا

پچھلے دنوں آپ پاکستان آئے ہوئے تھے۔ راولپنڈی کے ایک اجتماع میں آپ کے ہاتھ میں وہی ڈبیا نظر آ گئی مگر آپ کو خود کہنا پڑا کہ اس ڈبیا میں آج وہ پان نہ ملیں گے اور میں نے عرض کیا کہ اس ڈبیا میں اگر وہ پان بھی ہوتے جو میں نہیں کھاتا تو بھی کھا لوں گا۔ مگر اس اعتقاد کے باوجود اس بیہودہ پان کو چکھ کر یہ اندازہ ہوا کہ آپ کی ہر نفاست کے باوجود یہ پان اپنی کثافت نمایاں کئے بغیر نہ رہ سکا معلوم نہیں آپ نے کیونکہ اس پان کو اپنے لئے گوارا بنا لیا جس کا مزہ تو در کنار سرخی کا عالم یہ تھا کہ ؎

اگر آئی لب پہ سسکتی رہی

آپ کے لئے تو یہ آزمائش وقتی تھی مگر اپنا تو تصور بن چکی ہے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ زندگی میں رنگ آئے تو کہاں سے۔

شوکت تھانوی

سراج لکھنوی کے نام

گڑھی شاہو - لاہور

حبیبِ مکرّم!

آٹھ نو سال کے بعد لکھنؤ کا دورہ جو کیا تو زمین

آسمان بدلے ہوئے پائے۔ بھلا غضب خدا کا لکھنؤ سے تانگے اور یکّے سب

غائب اور ان سب کے بجائے وہ انسانیت سوز سواری جس کو سائیکل رکشا

کہتے ہیں جس میں گھوڑے کی قائم مقامی وہ انسان کرتا ہے جس کو اشرف المخلوقات

کہتے ہیں۔ رکشا پہ دو انسانوں کو بٹھا کر ایک انسان کھینچتا ہے۔ چوٹی کا پسینہ

ایڑی کو لاتا ہے۔ اپنے ڈھانچے کا ایک ایک جوڑ چٹخاتا ہے۔ سینہ دھونکنی

کی طرح چلتا ہے اور جب وہ اپنے شہ سواروں کو منزل پر پہنچاتا ہے تو اجرت

طلب کرتے وقت پیٹ میں سانس نہیں سماتی یہ انسانیت سوزی اس لکھنؤ میں نظر آئی جو تہذیب کا مرکز سمجھا جاتا ہے اور تہذیب کا یہ نمونہ دیکھ کر عقل دنگ رہ گئی کہ اگر یہی تہذیب ہے تو بدتہذیبی کس کو کہتے ہیں۔ خدا کے لئے بتائیے لکھنؤ کے وہ یکے والے اور لکھنؤ کے وہ تانگے والے کیا ہوئے جن کی فقرہ بازیاں مشہور تھیں کہ کوئی موٹی سواری دیکھ لی تو فقرہ چست کر دیا کہ حضور دو کھیپ میں آپ کو پہنچا سکونگا۔ یہ تو ہوا کرایہ اور زائد دام کمانی دم کر اتنے کے مانگ رہا ہوں۔ اور جب دام کسی طرح طے نہ ہوئے تو کہا کہ بہتر ہے حضور گھوڑے کی نظر بچا کر بیٹھ جائیے۔ یہ وہی لکھنؤ تو ہے جس کے ایک تانگے والے نے حضرت حفیظ جالندھری کے اس تقاضے سے کہ ذرا تیز چلو عاجز آ کر گھوڑے کو روک لیا تھا اور حفیظ صاحب سے دست بستہ عرض کیا تھا کہ حضور کیا آپ کا خیال یہ ہے کہ خود مجھے ارمان نہ ہوگا کہ میرا گھوڑا تیز چلے۔ ذرا اپنی چال دکھائیے مگر کیا عرض کیا جائے ایسا آرام طلب گھوڑا ہے کہ کبھی وضعداری میں فرق نہیں آنے دیتا۔ اللہ جانے کسی رئیس کا چشم چراغ ہے یا ضرورت سے زیادہ تعلیم یافتہ ہے یہی وجہ ہے حضور کہ اس کے سامنے گستاخی کرنے کی بھی ہمت نہیں ہوتی۔ آخر کیا ہوئے وہ تانگے والے

خدا جانے کس کی نظر کھا گئی

اور صرف رکشا ہی نہیں عرض تو کیا کہ لکھنؤ کچھ کا کچھ ہو کر رہ گیا ہے۔ وہ چکنی

چھچھانی محفلیں سونی پڑی ہیں۔ میں تو خیر وہاں سے چلا آیا مگر آپ سب کو کیا ہوا۔
سب ایک دوسرے سے غیر متعلق کچھ عجیب پراگندگی کے عالم میں پڑے
ہوئے ہیں۔ ایک کو دوسرے کی خبر نہیں بمشکل تمام آپکے متعلق صرف اتنا
معلوم ہو سکا کہ صحت خراب رہتی ہے خانہ نشین ہو کر رہ گئے ہیں۔ گھر ملنے گیا
تو سعادت یار خاں رنگین کا سید انشاء کے گھر جانا یاد آگیا۔ آپ کو دیکھ کر دھک
سے رہ گیا کہ یہ سراج کو کیا ہو گیا ہے۔ پہلوان تو خیر کبھی نہ تھے مگر ایسے چھوئی
موئی بھی نہ تھے۔ آخر رفیع احمد خاں کی بزم کے رتن تھے زندگی اور زندہ دلی
کے پیکر تھے۔ مگر دیکھا تو گویا زبانِ حال سے کہہ رہے تھے کہ ؎

نہ پوچھ دم بخود ہوں غم کی داستاں لئے ہوئے
چبا رہا ہوں ہونٹ قدرتِ بیاں لئے ہوئے

میں نے آپ سے تو کچھ نہ کہا مگر خود اپنے سے دل ہی دل میں کئی سوال کر ڈالے
کہ کیا یہ وہی سراج ہیں جن کی پارٹی کا نام تھا "ینگ پارٹی"۔ کیا یہ وہی سراج
ہیں جن کی محفل آرائیوں کا یہ عالم تھا ؏

پھول تھا زیبِ چمن پہ نہ پریشاں تھی شمیم

"معرکۂ سراجین" کا ہیرو میرے سامنے ایک ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی مانند موجود
تھا۔ اس سراج کی روشنی میں خود یہ سراج بھی بمشکل ہی نظر آتا تھا۔ دل کڑھا۔ جی
بھر آیا مگر میں نے اس تمام کیفیت کو ایک فرضی مسکراہٹ میں ڈھال کر آپ کو

پھر ایک مرتبہ زندگی کی طرف کھینچنے کی کوشش کی۔ آپ میرے ساتھ بزمِ احباب میں آئیے۔ خدا جانے کتنے دن کے بعد ہنسے بھی مگر پھر ایک افسردگی چہرے پر لئے واپس چلے گئے۔ جب تک بیٹھے رہے پچھلے دنوں ہی کو یاد کرتے رہے گویا حال کا مشغلہ صرف ماتمِ ماضی ہی بن کر رہ گیا ہے ؎

نشاطِ عہدِ رفتہ تجھ کو بھولنا محال ہے
لبِ سحر بھی شام کی ہے داستاں لئے ہوئے

مگر جاتے جاتے زبانِ بے زبانی سے اپنی اسی غزل کا یہ شعر سناتے گئے کہ ؎

شکستہ پا ہیں آج رہنے والے اس دیار کے
زمیں جہاں کی تھی مزاجِ آسماں لئے ہوئے

عجیب بات یہ ہے کہ یہ یاس انگیزی اور یہ بیدلی مجھے دوسرے احباب میں نظر نہیں آئی۔ پراگندگی دوسری بات ہے مگر جب میں نے اس شیرازہ کو یکجا کیا تو معلوم ہوا کہ خدا کے فضل سے ابھی سب کے سب بقیدِ حیات ہیں اور وہ لکھنؤ جو مجھ کو ایک لاش کی صورت میں نظر آیا تھا رفتہ رفتہ ذی روح محسوس ہونے لگا۔ میں لکھنوی نہیں ہوں مگر لکھنؤ سے مجھ کو محبت ہے اور ممکن ہے کہ یہ اسی محبت کا کرشمہ ہو کہ ؎

کچھ تو کہ جو ترا جنت کا نمونہ ہے بھی
کچھ مرے حسنِ تخیل کی بھی رعنائی ہے

اس میں شک نہیں کہ لکھنؤ مجھ کو بہت کچھ بدلا ہوا ملا۔ جس لکھنؤ کے لئے میں گیا تھا وہ بڑی تلاش کے بعد مشکل مل سکا مگر جب ملا تو میں نے یہی کہا کہ ع

خدا آباد رکھے لکھنؤ کو پھر غنیمت ہے

مگر یہ آباد تو جب ہی رہے گا کہ آپ اسے برباد نہ کریں اپنے زندہ رکھنے کی کوشش کریں تاکہ لکھنؤ زندہ رہ سکے اس کے بیلنے پر رکشا چلے اور وہ زندہ رہے۔ اس کی زبان کاٹی جائے اور وہ زندہ رہے۔ خدا کے لئے آپ اپنے کو مار کر لکھنؤ کو موت کے گھاٹ نہ اتار دیجیے۔

شوکت تھانوی

فیض احمد فیضؔ کے نام

گڑھی شاہو۔ لاہور

محبِ مکرم!

میں سگریٹ نہیں پیتا مگر جن لوگوں سے تعلقات خوشگوار نہ ہوں ان کی اس پیشکش کو کبھی رد بھی نہیں کرتا اور خواہ سگریٹ پی کر کتنا ہی بے کیف کیوں نہ ہونا پڑے مگر ان کے سگریٹ کا نقصان ضرور کرتا ہوں۔ اسی طرح میں پان ضرور رکھتا ہوں مگر اُن لوگوں کو کبھی نہیں کھلاتا جن کے متعلق مجھ کو علم ہے کہ یہ پان اس لئے نہیں کھاتے کہ خوش ہوں بلکہ اس لیے کھاتے ہیں کہ میں ناخوش ہو سکوں مگر نہ جانے کیا بات تھی کہ میں نے آپ کو زبردستی پان کھلانا چاہا، حالانکہ مجھ کو معلوم ہے کہ آپ پان نہیں کھاتے مگر جو تضاد

مجھ کو آپ کی زندگی میں نظر آیا اُسی نے یہ ضد مجھ میں پیدا کی کہ میں آپ کو پان کھلا کر دیکھوں تو سہی کہ آپ کیا نظر آتے ہیں اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ مجھ کو اپنی مرضی کے عین مطابق نظر آئے۔ اور معلوم ہوا کہ آپ کے وہ اشعار جن کو آپ تحت اللفظ پڑھ کر ایک فرض ناگوار کی صورت میں ادا کر دیا کرتے ہیں آپکے لبوں پر خود بخود مترنم ہو گئے ہیں۔ جب آپکے لبوں پر میرے دیئے ہوئے پان کا رنگ آیا تو میرا بیساختہ جی چاہا کہ اب آپ سے آپ کی وہ غزل سُنوں ؎

دوستو اس چشم و لب کی کچھ کہو جس کے بغیر
گلستاں کی بات رنگیں ہے نہ میخانے کا نام

ہاں تو میں آپ کی زندگی کے تضاد کا ذکر چھیڑ کر گذر گیا اور آپ حیران ہو گئے کہ یہ کیا تہمت لگا گیا۔ میں تضاد اس کو کہتا ہوں کہ ادارت کرتے ہیں ایک انگریزی روزنامے کی اور عہدِ حاضر کے عظیم المرتبت اُردو شاعر ہیں۔ شریکِ حیات ہیں ایک یورپین خاتون مگر نظر آتی ہیں وہ شلوار اور دوپٹے میں خالص مشرقی بہو بیٹیوں کے انداز سے یہ سب کچھ آپ کی زندگی کا تضاد نہیں تو اور کیا ہے اور اس اجتماعِ ضدین کو دیکھ کر اگر میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میں آپ کو پان کھلا کر دیکھوں تو کیا غلط پیدا ہوئی بلکہ میرا تو جی چاہتا ہے کہ آپ کا وہ گھر جس کی صاحبۂ خانہ مشرقی لباس میں ایک مغربی خاتون ہیں پاندان سے بھی

خالی نہ رہے اور خود ان کے مشرقی لباس کی تکمیل اس طرح ہو کہ وہ شلوار اور دوپٹے کے ساتھ پان کھاتی بھی نظر آئیں۔ مگر ان کے پان کھانے سے پہلے آپ کا پان کھانا ضروری ہے اس کے بعد تو وہ خاتون جس کے جذبۂ شوہر پرستی کا یہ عالم ہے کہ اپنے شوہر کی مشرقیت کو دیکھتے ہوئے خود اپنے کو بھی مشرقی سانچے میں ڈھال لیا ہے، کیا پان کو نہ اپنا لے گی۔ وہ تو پان اس لئے نہیں کھاتیں کہ خود آپ نہیں کھاتے اور آپ کا وہ گھر جو مشرقی اور مغربی امتزاج کا ایک معیاری گھر ہے پاندان یعنی ایک خالص مشرقی علامت سے خالی ہے۔

آپ کو خود اپنے گھر کی وہ مختصر سی صحبتِ شعر و سخن یاد ہے جس میں آپ کو پانوں کا اہتمام بازار سے کرنا پڑا تھا اور چونکہ وہ بازار کے پان تھے لہذا ان کے ساتھ کچھ یونانی ادویہ از قسم سونف اور ملیٹھی وغیرہ بھی تھیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پان صرف وہ لوگ کھا سکتے تھے جو در اصل پان نہیں کھاتے۔ حضرت جگر مرادآبادی قسم کے پان کھانے والے مہمانوں نے خود اپنی ہی ڈبیا کے پان کھائے تھے۔ خیر میرا تو ذکر ہی نہیں ہے تو یہ پان ہی نہیں کھاتا جو آجکل یہاں ملتے ہیں اور خدا جانے کیوں پان کھلاتے ہیں میرے پاس خود میرے مسالے کی ڈبیا ہوتی ہے اور میں اس سلسلے میں اپنے کسی میزبان کو کبھی تکلیف نہیں دیتا مگر میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر آپکے یہاں پاندان آجائے تو اس پاندان سے میں یہ پان تک کھانے کو تیار ہوں جو میں نہیں کھاتا۔

یہ مکتوب یہیں تک پہنچا تھا کہ ایک معتبر روایت یہ بھی پہنچی کہ آپ بیشک پان نہیں کھاتے مگر بیگم فیض پان کھاتی ہیں اگر یہ سچ ہے پھر تو آپکے لئے اور بھی پان کھانا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ ایک مغربی خاتون ہو کر اس شدت سے اپنے کو مشرقی رنگ میں رنگ چکی ہیں اور آپ اس کے باوجود پان سے بیزار ہیں۔

آپ کو پان کھلانے کی یہ ضد ہے ضرور عجیب و غریب مگر معلوم نہیں کیا بات ہے مجھ کو جس کسی سے بھی تعلقِ خاطر پیدا ہو جاتا ہے میرا جی چاہتا ہے کہ وہ اس نعمت سے محروم نہ رہے۔ آپ کی شخصیت سے تو خیر میں اُس وقت متاثر ہوا جب لاہور میرا وطن بن گیا مگر آپ کو بحیثیت ایک عظیم شاعر کے اُسی وقت سے پوجنا شروع کر دیا تھا جب آپ کی یہ غزل نظر سے گذری تھی ؎

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شبِ غم گذار کے

اک فرصتِ گناہ ملی وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

اس بلا کے تغزل کے بعد حیرت ہے کہ آپ کو پان میں تغزل محسوس نہیں ہوتا۔ جو مشرقیت آپ کی شاعری میں ہے اس کا رنگ پان سے اور بھی چوکھا ہو سکتا ہے ممکن ہے آپ حسبِ عادت میری ان باتوں پر بھی مسکرا کر رہ جائیں مگر سو باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ مجھ کو آپ بھی محبوب ہیں اور پان بھی لہٰذا میں اپنے

ان دونوں محبوبوں کو یکجا دیکھنا چاہتا ہوں۔ آپ معلوم نہیں بغیر پان کھائے ایسے رنگین شعر کیونکر کہہ لیتے ہیں مگر میں آپ کے کلام کی یہ بے حرمتی نہیں کرسکتا کہ بغیر پان کھائے اس کا مطالعہ شروع کردوں اس وقت آپ کی یہ غزل سامنے ہے ؎

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گذری ہے

لہذا میں پاندان کی طرف بڑھ رہا ہوں کہ ایک تازہ گلوری کھالوں تو یہ غزل پڑھوں اور اس کا صحیح کیف حاصل کردوں۔

شوکت تھانوی

شکیلؔ بدایونی کے نام

گڑھی شاہو۔ لاہور

عزیزی و حبیبی!

فلموں کی طرف ہجرت میری اور آپ کی تقریباً ساتھ ساتھ ہوئی تھی فرق تھا صرف لاہور اور بمبئی کا۔ آپ دِلّی سے بمبئی گئے اور میں لکھنؤ سے لاہور آیا۔ آپ کاروبار میں مبتلا ہو گئے اور میرے پنجے سے نکل آئی۔ مگر میری سمجھ میں یہ بات چار پانچ ہی سال میں آگئی کہ فلم ایک ضمنی مشغلہ رہے تو اچھا ہے مگر آپ "فنا فی الفلم" ہو کر رہ گئے اور اب آپ بجا طور پر مجھ سے کہہ سکتے ہیں کہ ؎

مجھے تجھ سے خاص نسبت ہے میں رہینِ موجِ طوفاں
جنھیں زندگی تھی پیاری انھیں مل گیا کنارا

میں نے فلم سے قطعی کنارہ تو نہیں کیا مگر ایک سبکسار کی حیثیت سے ساحل ہی سے اس کے مد و جذر کا تماشہ دیکھتا رہا اگر کوئی موج کبھی ساحل تک آ کر میرا دامن بھی تر کر گئی تو اس تر دامنی سے اجتناب بھی نہیں کیا مگر از خود کبھی اس طوفان میں کودا بھی نہیں۔ ممکن ہے آپ کو فلمی دُنیا کا وہ تجربہ نہ ہُوا ہو جو مجھ کو ہوا ہے اسی لئے میں آپ سے تبادلۂ خیال کرنا چاہتا ہوں۔ میں درا صل فلمی دُنیا کو ادبی دُنیا ہی کا ایک گوشہ سمجھ کر گیا تھا مگر وہاں پہنچکر معلوم ہُوا کہ فلم کا ادب سے برائے نام ہی تعلق ہے۔ اور وہاں ہر قدم پر ضرورت یہ پیش آئی کہ ادب کو بالائے طاق رکھ کر اور اپنے معیار سے اپنے کو زبردستی نیچے گھسیٹ کر فلمی خدمات انجام دیجئے۔ خیال تھا کہ اب چونکہ اُن سیٹنے اور ابوجہل کی نسل کے تھیٹریکل منشیوں کے بجائے کچھ چوٹی کے ادیب اور شاعر فلمی دُنیا کا رُخ کر رہے ہیں لہٰذا اب ہمارے فلموں کا بھی ایک معیار قائم ہو جائے گا اب اس سے اُونچی چوٹی کے ادیب ہمارے ادب کو کہاں میسّر تھے کہ پریم چند فلمی دُنیا میں گئے۔ کرشن چندر اور بیدی گئے۔ آپ اور مجروح گئے۔ جوش اور ساغر گئے مگر ہمارا فلمی لٹریچر جہاں تھا وہیں رہا ؎

هزاروں ماہتاب آئے ہزاروں آفتاب آئے
مگر ہمدم وہی ہے ظلمتِ غم خانہ برسوں سے

مگر میں جانتا ہوں کہ ان سب کے ساتھ بھی وہی ہُوا ہو گا جو میرے ساتھ ہو چکا تھا کہ اگر اپنا

لکھا پڑھا سب بھول کر اپنے کو اس معیار پہ لاسکو جو سینما کے تماشائیوں کا ہو سکتا ہے تو تم کامیاب ہو اور اگر یہاں لٹریچر چھانٹنے آئے ہو اور قابلیت گھبارنا چاہتے ہو تو تمھاری اس دنیا میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ میں آپ کو خود اپنا ایک حادثہ سُناتا ہوں کہ ایک فلم کے مکالمے ایک نہایت جہالت مآب فلم ساز کو سُنا رہا تھا ایک فقرہ آگیا کہ "تمھیں دیکھنے کا ارمان ہے" وہ حضرت ایک مرتبہ چونکے اور پوچھا "ارمان؟ - ارمان کیا ہوتا ہے؟ یہ ٹھیک نہیں ہے کچھ اور ہونا چاہیئے جب ارماں میں نہیں سمجھا تو کوئی اور کیا سمجھے گا۔" غصّہ تو بہت آیا کہ آپ کہاں کے ایسے مستند سمجھدار ہیں مگر فوراً خیال آگیا کہ یہاں لڑنے تو نہیں آئے ہیں کمائی کرنے آئے ہیں لہذا غصّے کو پی کر بڑی عاجزی سے عرض کیا کہ "جی ہاں یہ لفظ ارمان مجھے خود کھٹکا تھا اور میں اس کی جگہ کسی مناسب لفظ کی تلاش میں ہوں اگر آپ کے ذہن میں کوئی لفظ آئے تو بتائیے۔" یہ سُنکر وہ خوش ہوگئے اتنا خوش ہوئے کہ چائے کا آرڈر دے کر سگریٹ تک پلیش کر دی اور پھر غور کرنے لگے۔ کچھ دیر کے بعد چٹکی بجا کر اُچھلے اور کہنے لگے "تسلّی کیسا رہے گا" اب میرے اُچھلنے کا وقت تھا مگر داد دیجئے کہ میں نہ اُچھلا نہ کودا صرف بڑی سادگی سے پوچھا کہ "پورا جملہ کیا ہوگا؟" وہ بڑے اطمینان سے بولے "تمھیں دیکھنے کا تسلّی ہے" آپ جانتے ہیں میں نے کیا کیا۔ نہ مسودہ ان کے منہ پر مارا۔ نہ تھپڑ اپنے منہ پر۔ بلکہ ان کے سامنے ہی ارمان کاٹ کر تسلّی لکھ دیا۔ مگر ڈائیلاگ کے ریہرسل میں ارمان

ہی کا ریہرسل کراتا رہا یہاں تک کہ شوٹنگ کے وقت جب اُن فلم ساز صاحب نے پھر ارمان سُنا تب مجھے بُلا کر کہا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے تسلّی نہیں ہو رہا ہے ارمان ہو رہا ہے"، میں نے عرض کیا کہ "کیا اب بھی آپ کو کوئی اعتراض ہے میں نے تسلّی لکھا تھا اسے کٹوا کر آپ نے ارمان لکھوایا۔ اب اس ارمان سے بھی ناراض ہو گئے"۔ وہ حضرت پہلے تو جھکڑ لائے پھر ان کو جیسے یاد آ گیا کہ واقعی میں نے تسلّی لکھا تھا جس کی جگہ ان کے مشورے سے ارمان لکھا ہے اور اس طرح یہ بیہودہ قضیہ ختم ہوا۔

قصّہ مختصر یہ کہ اس فلمی دُنیا میں تو دراصل یہ فلم ساز سخت پریشان رہتے ہیں صحیح قسم کے ادب یا شعر کے نام سے بھی۔ کسی واضح انقلاب کی تو وہاں کوئی گنجائش ہی نہیں البتہ چپکے چپکے اگر کچھ سلیقے کی باتیں پیش ہوتی رہیں تو شاید کوئی اصلاح ہو سکے۔ مطلب تو صرف یہ ہے کہ ان فلم سازوں کو چونکنے نہ دیا جائے ادب اور شعر کا نام لے کر سے

یہ محفل زاہدانِ خشک کی محفل ہے اے رندو
ذرا اس بزم میں ذکرِ شراب آہستہ آہستہ

مگر چھوڑیئے اس ذکر کو ہم یا آپ کہاں کے انجمن ترقیٔ اُردو واقع ہوئے ہیں کہ ادب پروری اور ادب نوازی کرتے ہیں خواہ ٹھنڈے چولہے میں جو ہے اپنا اکھاڑہ ہی کیوں نہ بنا لیں مطلب ہے روپے سے اگر وہ مل رہا ہے تو بس ٹھیک ہے رہ گئی ادبی خدمت وہ بھی اس حد تک تو ہوتی ہی رہتی ہے کہ آپ کے فلم میں

ہونے سے معیار کو لاکھ گرانے کی کوشش کی جائے پھر بھی کہیں نہ کہیں تو سلیقہ نظر آ ہی جاتا ہے۔

اس وقت میں آپ سے مخاطب ہوں اور تصور میں آپ دیسی نہ سہی مگر احمد آبادی پان کھاتے نظر آ رہے ہیں۔ ہاں صاحب کھائیے خوب کھائیے آپ کو حق ہے پان کھانے کا ہماری طرح نہیں کہ اپنے خشک مسالے پر قناعت کئے بیٹھے ہیں ۔

تو ہے اور دریا دلی ہے ساقیا
میں ہوں اور تشنہ لبی ہے آجکل

دریا دلی سے یہ مطلب نہیں کہ آپ تشنہ کاموں کو بھی سیراب کرتے ہیں خود اپنے کو بھی سیراب کرنا کیا کم دریا دلی ہے۔ اُٹھئے اور میرے نام کا بھی ایک پان بنا کر کھا لیجئے۔ میں آپ کی یاد میں خشک مسالے کا پھنکا مار رہا ہوں۔

شوکت تھانوی

ماہرالقادری کے نام

گڑھی شاہو - لاہور

مرشدی و مولائی!

آپ سے زیادہ اس بات کا اندازہ اور کس کو ہوگا کہ انسان اپنے چہروں پر کیسے کیسے نقاب ڈالے پھرتے ہیں اور ان نقابوں کے نیچے جو چہرے ہوتے ہیں وہ ان نقابوں سے کس قدر مختلف ہوتے ہیں۔ مجھ کو تو نہ جانے کیوں ہر اجتماع پر کچھ فینسی ڈریس قسم کے میلے کا گمان گذرتا ہے اور جب کسی اجنبی سے ملتا ہوں جی چاہتا ہے کہ ملتے ہی اُس نقاب کے اندر جھانک کر دیکھ لوں اور اس فریبِ نظر میں مبتلا رہنے کی خود کوشش نہ کروں جس میں مجھ کو مبتلا رکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ مجھے یاد نہیں کہ

میں آپ سے پہلے پہل کہاں ملا تھا۔ مگر یہ یاد ہے کہ ملتے ہی میں نے آپ کو
برافگندہ نقاب بھی دیکھ لیا تھا اور اطمینان ہو گیا تھا کہ فرشتوں کی سی صورت
بنائے ہوئے یہ دراصل انسان ہی ہے جس سے میں ملا ہوں حالانکہ تقدّس کا
یہ غازہ آپ نے بڑے ماہرانہ انداز سے چہرے پر مل رکھا تھا۔ گفتگو میں بڑی
قادرانہ معصومیت بھی پائی جاتی تھی۔ کیسی بھولی بھولی باتیں آپ کر رہے تھے۔
چہرے سے نور اور آنکھوں سے ایمان کا سرور برس رہا تھا کہ یکایک ایک
طرف سے کفر کا طوفان امڈا۔ کہکشاں کی گرد اڑاتا ایک جھاڑو ستارہ نظر
آیا اور جب یہ گرد چھٹی تو چودھویں کا چاند نگاہوں کے سامنے نکھر کر آ گیا
اور نتیجہ یہ ہوا کہ ؎

اک شیخ کے تو ہاتھ سے تسبیح گر گئی

وہ چہرے کا تقدّس حیرت بن گیا۔ نگاہیں اٹھیں تو جھکنا بھول گئیں۔ اور آخر بڑی دیر
کے بعد یہ طلسم ٹوٹا۔ دونوں ہاتھ کانوں پہ آ گئے اور رخساروں پہ توبہ کے طمانچے
پڑنے لگے۔ بار بار آپ لاحول پڑھتے تھے اور رخساروں پہ طمانچے مارتے تھے
آپ تو خیر انسانیت سے گذر کر پھر فرشتہ بننے کی کوشش کر رہے تھے مگر
آپ کے مقرّبین کو یہ اطمینان ہو چکا تھا کہ اس فرشتے میں انسانیت اب تک موجود
ہے ؎

ماہر کی سادہ باتوں سے اللہ بچا ناہی رکھے
خود تو یہ بڑے ہی حضرت ہیں اوروں کو نصیحت ہوتی ہے

بہر حال ایک ہی جھٹکے میں گوشۂ نقاب کچھ اس طرح اُٹھا کہ آپ کی زیارت ہو گئی اور پھر تو آپ ایسا کھلے کہ اپنی ہی قسم کے صرف انسان ہی نہیں بلکہ زندہ انسان نظر آئے۔ آپ کی پاکبازی تسلیم۔ آپ کا زہد و تقدس بجا مگر خود آپ ہی نے تو ایک جگہ اپنے حالات لکھتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ :-

" تجربہ نے بتایا ہے کہ شاعری کی جو اسلام نے حوصلہ افزائی نہیں کی اس کا ایک سبب شاید یہ بھی ہے کہ شاعر کی جوانی رنگینیوں سے بچ نہیں سکتی اس سمندر میں کوئی ڈوبے گا نہیں تو تر دامن ضرور ہو جائے گا۔ شعر و ادب کی شہرت اپنی جگہ خود ایک فتنہ عظیم ہے

نغمۂ شعر و جوانی کا وہ عالم توبہ

میری آنکھوں میں قصیدے تھے ہونٹوں پہ غزل

اس انداز کے شعر اُسی دور کی یادگار ہیں۔

اس تحریر میں اگر آپ اجازت دیں تو صرف پہلے ٹکڑے کی داد دے دوں "تجربہ نے بتایا ہے"۔ اور کوئی دھوکہ کھا جائے تو دوسری بات ہے مگر مجھے تو پہلے ہی یقین تھا کہ ہو نہ ہو آپ ہیں "تجربہ کار" ضرور

اپنے ان ہی حالات میں آپ نے یہ بھی تو فرمایا ہے کہ :-

" مولانا میں کسی صورت سے بھی نہیں ہوں۔ لیکن یار لوگوں نے مجھے مولانا بنا دیا ہے۔ یا تو لوگوں نے میرے ساتھ مذاق کیا ہے

یا وہ بیچارے میری شخصیت اور ذات کے بارے میں شدید
غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔"

مولانا آپ کسی صورت سے خواہ نہ ہوں مگر خود اپنی صورت سے ضرور ہیں۔
یا ر لوگوں سے زیادہ آپ نے خود اپنے کو مولانا بنا دیا ہے اور ہماری اس
بیچارگی پر آپ کو ترس بھی نہیں آتا کہ ہم آپ کی شخصیت اور ذات کے بارے میں
شدید غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔

قصہ صرف یہ ہے کہ آپ فرشتہ نہیں صرف انسان ہیں اس سے میری
مراد یہ نہیں کہ مجھے آپ کی پاکبازی میں شک ہے مگر انسان بھی تو پاکباز ہو سکتا ہے
بلکہ سب سے بڑے فرشتے عزازیل نے تو فرشتوں کا ریکارڈ ایسا خراب کیا ہے کہ فرشتہ
بن جانا کوئی خوبی نہیں رہی ہے۔ شکر ہے کہ آپ مجھ کو انسانیت کے جامے میں
نظر آئے اختلاف صرف اس سے ہے کہ آپ کو کبھی کبھی خود اپنا مولانا ہونا
ایسا یاد آتا ہے کہ ہم فرش نشینوں کی سطح سے اچک کر ایک دم منبر پر پہنچ
جاتے ہیں مثلاً اپنے ہی چند شعر سنئے ؎

یہ کمسنی کا زمانہ یہ ابتدائے شباب
یہ شوخیوں کے افق سے طلوعِ مہرِ حجاب
جھکی جھکی سی نگاہوں کے نیم وا غنچے
رکا رکا سا تبسم کہ نا شگفتہ گلاب

ز فرق تا بقدم سحر و نغمہ و مستی
نظر نظر ہیں فسانہ نفس نفس ہیں رباب
جو دیکھیئے تو ہر اک پر نظر توجّہ کی
جو سوچیئے تو کسی سے نہیں ہے کوئی خطاب

یہاں تک شاعر نے نظم کہی پھر اس کو یکایک اپنا مولانا ہونا یاد آ گیا چنانچہ مولانا نے یہ آخری شعر کہا ؎

خدا کرے یہ نگاہِ جہاں سے دور رہے
کہ اس زمانے میں ہے عصمتِ نظر نایاب

ملاحظہ فرمایا آپ نے فرق ؟

•

شوکت تھانوی

احمد ندیم قاسمی کے نام

گڑھی شاہو - لاہور

محبِ مکرّم!

اللہ اللہ آپ کی ایک شخصیت میں انواع و اقسام کی کتنی حیثیتیں موجود ہیں۔ شاعر آپ افسانہ نگار آپ صحافی آپ اور سیاستدان آپ۔ مگر میں تو ان تمام حیثیتوں سے گذر کر آپ ہی کے الفاظ میں آپ کے متعلق صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ ؎

انساں عظیم ہے خدایا

اور واقعہ بھی یہی ہے کہ ؎

ہمیں تو عظمتِ انساں کو آزمانا ہے

بلکہ آزما چکے ہیں۔ بار بار آزما چکے ہیں اور یہ عظمت ہمیشہ عظمت ہی رہی ہے۔ آپ کی شاعری۔ آپ کی افسانہ نگاری۔ آپ کی انشاپردازی اور آپ کی صحافت کو بعد میں زیر بحث لاؤنگا اور خدا جانے لاؤنگا بھی یا نہیں مجھے تو آپ کی انسانیت ہی میں اتنی محبوبیت نظر آتی ہے کہ اُسی کے ذکر کے لئے ایک مستقل دفتر کی ضرورت ہے۔ قصہ دراصل یہ ہے کہ مجھے آپ پر اس وقت غصہ بھی آرہا ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ انسان میں خوبیاں ہی خوبیاں ہوں جینے کے سہارے کے طور پر ایک آدھ خامی بھی نہ ہو۔ خیر صاحب آپ شراب نہیں پیتے نہ سہی کم سے کم تمباکو ہی کھا لیا کرتے۔ آپ اس کے جواب میں کہیں گے کہ سگریٹ تو پیتا ہوں۔ جی ہاں مجھے معلوم ہے جیسی آپ سگریٹ پیتے ہیں۔ کاش آپ نے اپنے کو سگریٹ پیتے ہوئے بھی دیکھا ہوتا کہ کس قدر اناڑی معلوم ہوتے ہیں۔ یوں تو آپ خیر سے پان بھی کھا لیتے ہیں۔ مگر سچ کہیئے گا پان کھانے اور گنڈیریاں چوسنے میں آپ نے کبھی کوئی فرق محسوس کیا۔ خون لگا کر شہیدوں میں شامل ہونا دوسری بات ہے ورنہ یہ واقعہ ہے کہ آپ پان نہیں کھاتے میرے سوال پر کس فخر سے آپ نے فرمایا تھا کہ جی ہاں پان کھاتا کیوں نہیں ہوں البتہ خود خرید کر کبھی نہیں کھایا کاش آپ کو معلوم ہوتا کہ پان خرید کر بھی نہیں بلکہ اپنے کو بیچ کر کھایا جاتا ہے۔ آپ گھبرا رہے ہوں گے کہ اس کمبخت نے وہی پان کی بکواس شروع کر دی۔ جی نہیں۔ آپ سے

بھلا میں پان کا ذکر کیوں کرونگا۔ آپ کیا جانیں کہ پان کیا ہوتا ہے میں تو یہ عرض کر رہا تھا کہ یہ بھی کوئی انسانی خوبی ہے کہ بس خوبیاں ہی خوبیاں ہوں۔ میری سمجھ میں تو یہ بات آتی نہیں کہ بغیر خامیوں کے انسانیت کیونکہ پختہ ہو سکتی ہے بغیر لغزشوں کے زندگی کا یہ سفر کیونکر طے ہو سکتا ہے۔ انسان خطا و نسیان کا مرکب کہا گیا ہے مگر آپ عجیب قسم کے انسان ہیں کہ آپ کی ترکیب میں یہ دونوں لازمی اجزا غائب نظر آتے ہیں۔ جہاں تک شرافت کا تعلق ہے میرے خیال میں بس یہ کافی ہے کہ انسان خاندانی طور پر شریف ہو مگر آپ ہیں کہ ذاتی طور پر بھی اس حد تک شریف بنے ہوئے ہیں کہ آپ کو فرشتہ ثابت کرنا جتنا آسان ہے انسان ثابت کرنا اتنا ہی مشکل ہے۔ دوستوں کے تو سب ہی دوست ہوتے ہیں مگر آپ اللہ جانے کس دل گردے کے ساتھ ان کے ساتھ بھی دوستی نباہتے رہتے ہیں جو دوستی کے پردے میں آپ کو جل دے جائیں۔ سوال یہ ہے کہ ایسے شریف آدمی سے کوئی کیا تعلق رکھے۔ نہ کوئی نشیب ہے نہ فراز۔ نہ کوئی گھماؤ ہے نہ پھراؤ بس ایک سپاٹ قسم کی شرافت۔ سوال یہ ہے کہ خود آپ کا جی نہیں گھبراتا اس مسلسل اور مستقل شرافت سے۔ ہائے کیسا کیسا جی چاہتا ہے کہ کبھی ندیم سے بھی کوئی غلطی سرزد ہو۔ ان حضرت کی بھی کوئی لغزش نظر آجائے تو خدا شکر ادا کروں کہ اس فرشتے میں بھی انسانیت کی رمق نظر آگئی۔ بڑی جستجو کے بعد ایک گھر کے بھیدی نے یہ لنکا ڈھائی ہے

کہ ندیم گھر کے اندر کھل کھیلتے ہیں۔ عزیزہ خدیجہ مستور نے آپ کی شخصیت پر جو کچھ لکھا ہے اُس سے کچھ کچھ اطمینان ہوتا ہے کہ خواہ کتنی ہی بھولی بھالی کیوں نہ ہوں مگر کچھ شرارتیں ہیں تو سہی جو آپ سے بھی منسوب کی جاسکتی ہیں۔ مگر ایسی بناسپتی شرارتیں بھی کس کام کی کہ کسی بچی کو ستانے کے لئے اُس کی گڑیا کو کوسنا شروع کر دیا۔ حلوہ کھانے کے لئے نت نئے بہانے تراش لئے۔ کبھی خدیجہ کو پیٹنے کی دھمکی دے دی کبھی آنچی سے جھگڑنے بیٹھ گئے ؎

انساں عظیم ہے خدایا

مگر اُسے ایسی چھوٹی اور بچکانہ شرارتیں کرتے شرم نہیں آتی۔ اتنا بڑا آدمی اور اتنی چھوٹی شرارتیں۔ طفیل صاحب نے آپ کی شخصیت پر جو کچھ لکھا ہے اُس میں ایک رومان بھی ہے۔ بھئی خدا کرے یہ سچ ہو حالانکہ آپ سے ڈر ہی معلوم ہوتا ہے کہ کہیں آپ یہ نہ کہدیں کہ ؏

ہم بھو بیٹیاں یہ کیا جانیں

بات یہ ہے کہ اس قسم کی باتوں پہ یقین اس لئے نہیں آتا کہ یہ باتیں درأصل آپ کے بس کی ہیں نہیں۔ آپ لاکھ اپنے کو سمجھاتے ہیں۔ اُبھرتے ہیں۔ کسمساتے ہیں حد یہ ہے کہ یہاں تک کہہ گذرتے ہیں کہ ؎

مری غیور امنگو شباب فانی ہے
غرورِ عشق کا دبریہ کھیل ہار دو بھی

"غیور" اور "غرور" کے پردے ڈال کر آپ نے بات صرف اتنی کہی ہے :۔

لاج کی ماری کیسے منہ سے میں بولوں اور جوانی بیتی جائے

مگر مصیبت یہ ہے کہ آپ سے پھر بھی محبت ہے۔ آپ پان نہیں کھاتے پھر بھی اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ شخصیت نہایت مکمل ہے کاش کسی خامی کی آرائش بھی ہوتی۔ یہی کیا کم ہے کہ غلطیاں نہیں کرتے مگر سزا پاتے ہیں۔ دعا صرف یہی ہے کہ خدا آپ کو کم سے کم اتنی بزدلی ضرور دے ہی دے کہ کبھی کبھی ذرا ڈگمگا بھی جایا کریں۔ اس دعا کے بعد اب صرف ایک التجا باقی رہ جاتی ہے کہ لیجئے ایک پان میں بناتا ہوں آپ کھا لیں آپ کا پان کھانے کا الھڑپن مجھے اس لئے محبوب ہے کہ آپ کی زندگی میں کچھ نہ کچھ تو رنگ نظر آ ہی جاتا ہے۔

شوکت تھانوی

شوکت تھانوی کے نام

گڑھی شاہو۔ لاہور

حبیب مکرّم!

آپ کے وہ خطوط نظر سے گذرے جو آپ نے

"بارِ خاطر" کے نام سے بزعمِ خود مولانا ابوالکلام آزاد کی "غبارِ خاطر" کی پیروڈی کے طور پر تحریر کئے ہیں۔ اس سلسلے میں سوائے اس کے اور کیا عرض کر سکتا ہوں کہ خدا ہی آپ سے سمجھے۔ کاش آپ نے اپنے چھوٹے مُنہ سے یہ بڑی بات کرنے سے پہلے یہی اندازہ کر لیا ہوتا کہ کہاں مولانا ابوالکلام آزاد اور کہاں جناب کی ذات والاصفات ؎

آسماں کو زمیں سے کیا نسبت

مولانا آزاد کی دوسری خصوصیات کو جانے دیجئے کہ وہ بیک وقت مصنف بھی ہیں۔ مفکر بھی۔ مقرر بھی۔ مدبر بھی اور فلسفی بھی۔ صرف ان کی ادبی حیثیت کو لے لیجئے تو وہ بھی اس قدر بلند ہے جہاں سے آپ کے ایسے حشرات الارض نظر بھی نہیں آتے۔ وہ ایک صاحبِ طرز انشاء پرداز ہی نہیں ہیں بلکہ ادبیات میں ان کا کوئی بھی حریف نہیں۔ آپ چلے ہیں ان کی پیروڈی کرنے یعنی اُس ادب کی پیروڈی کرنے جو خود آپ کی سمجھ سے بلند و بالا ہے۔ آپ کے ان مکاتیب سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے غالباً غبارِ خاطر کو صرف اتنا ہی سمجھا ہے کہ مولانا نے ان تمام اشعار کے استعمال کے لئے یہ خطوط لکھے ہیں جو ان کے حافظہ میں محفوظ تھے۔ یا زیادہ سے زیادہ آپ کے پلے مولانا کا چائے سے شغف پڑ گیا ہے جس کو آپ نے اپنے پان کے رنگ میں پیش کیا ہے۔ اگر اسی کا نام پیروڈی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ خیر سے آپ پیروڈی کے مفہوم سے بھی نا آشنا ہیں۔ اس کو پیروڈی سے زیادہ مُنہ چڑھانا کہنا چاہیے ع

زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجیے دہن بگڑا

اس کو اگر کچھ کہا جا سکتا ہے تو ادب کے ساتھ بے ادبی۔ بلکہ یہ بے ادبی بھی اس ذیل میں آتی ہے کہ :-

بازی بازی بارِیش بابا ہم بازی

اور آپ کے اسی بھکنے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ آپ کی اس "بارِ خاطر" میں جو اسم با مسمّٰی ہے اور واقعی بارِ خاطر ہی ہے جگہ جگہ عالم یہ ہے کہ ؎

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدّعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

آپ نے اس مجموعہ میں اپنے دوستوں۔ عزیزوں اور بزرگوں کے نام جو مکاتیب لکھے ہیں اگر ان پر غبارِ خاطر کی پیروڈی کا لیبل چسپاں نہ ہوتا تو محض بطورِ خطوط کے وہ پھر بھی غنیمت تھے حالانکہ پھر بھی میں یہ تجویز ضرور پیش کرتا کہ اپنے ان خطوط کے مجموعے کا نام آپ پاندان رکھ دیجیے مگر بحالتِ موجودہ تو اس مجموعہ کی حیثیت اگالدان کی ہے کہ آپ نے ابوالکلام آزاد ایسے مستند صاحبِ طرز کا طرز اُڑانے کی کوشش کی ہے اور گت یہ بنی ہے کہ "کوا چلا ہنس کی چال اور اپنی چال بھی بھولا"۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح مولانا ابوالکلام آزاد نے غبارِ خاطر میں اپنا دماغی پس منظر دُنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ آپ نے بھی بارِ خاطر میں اپنا دماغی توازن کھو کر اس کا پس منظر دُنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ کہاں مولانا آزاد کا اندازِ بیان کہاں جناب کا قلم ع

کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور

غبارِ خاطر میں صرف خطوط نہیں ہیں۔ بڑے بڑے مسائل ہیں بڑے بڑے پیچیدہ عقدے ہیں۔ خیر وہ مسائل نہ سہی وہ عقدے بھی جانے دیجیے۔ پیروڈی

کے لئے یہ ضروری تھا کہ کم سے کم اندازِ بیان ہی متصل ہوتا۔ جملوں کی ساخت اور فقروں کی ترکیب ہی ملتی جلتی ہوتی۔ چائے کے بجائے پان کا ذکر کیا تھا تو وہی ذرا سلیقے سے کیا ہوتا۔ پیروڈی جس کا ترجمہ صرف "ریڑہ مارنا" ہو سکتا ہے ہنسنے ہنسانے کی چیز ہے مگر آپ نے پیروڈی کی یہ نئی قسم ایجاد کی ہے جسے دیکھ کر رونا آتا ہے۔ "بارِ خاطر" کے مصنف کے لئے اگر بارِ خاطر نہ ہو تو یہ دوستانہ مشورہ پیش کرتا ہوں کہ ان مکاتیب پر سے غبارِ خاطر کی پیروڈی کا لیبل اتار لیجئے۔ اس کا نام بارِ خاطر بھی نہ رکھئے سیدھا سادا نام "مکاتیب شوکت" رکھ لیجئے۔ اس لئے کہ یہ واقعہ ہے کہ جہاں تک پیروڈی کا تعلق ہے پیروڈی تو بس یہیں پر ختم ہو گئی کہ آپ نے "غبارِ خاطر" کی جگہ اپنے اس مجموعہ کا نام "بارِ خاطر" رکھ دیا۔ مگر اس کے بعد آپ کو چاہیئے تھا کہ قارئین کے لئے بارِ شاطر بنتے آپ تو سچ مچ بارِ خاطر ہی بن گئے۔

مگر یہ باتیں آپ کی سمجھ میں کیوں آئیں گی ایسے ہی سمجھدار ہوتے تو یہ ناسمجھی کیوں کرتے۔ غرض تو کیا کہ چلے تھے آپ مولانا کا طرز اختیار کرنے اور ہوا یہ کہ اپنا طرز بھی کھو بیٹھے ؎

ہاں اہلِ طلب کون سُنے طعنۂ نایافت
دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

شاید آپ بُرا مان گئے ہوں تو جانے دیجئے۔ چھوڑیئے اس ذکر کو آپ سے تو